مرتبہ

عبدالحفیظ صدیقی

علی گڑھ کے "مغنیٔ آتش نفس"

مجازؔ مرحوم

کی

یاد میں

ایڈیٹر

نذرِ علیگڑھ

مجازؔ مرحوم

جو طاقِ حرم میں روشن ہے وہ شمع یہاں بھی جلتی ہے
اِس دشت کے گوشے گوشے سے اک جوئے حیات اُبلتی ہے

اسلام کے اس بُت خانے میں اصنام بھی ہیں اور آذر بھی
تہذیب کے اس میخانے میں شمشیر بھی ہے اور ساغر بھی

یاں حُسن کی برق چمکتی ہے، یاں نور کی بارش ہوتی ہے
ہر آہ یہاں اک نغمہ ہے ہر اشک یہاں اک موتی ہے

ہر شام ہے شامِ مصر یہاں، ہر شب ہے شبِ شیراز یہاں
ہے سارے جہاں کا سوز یہاں اور سارے جہاں کا ساز یہاں

یہ دشتِ جنوں دیوانوں کا، یہ بزمِ وفا پروانوں کی
یہ شہرِ طرب رومانوں کا یہ خلد بریں ارمانوں کی

مجاز

فہرست حصۂ اوّل

فہرست حِصّہ دوم

حرفِ اوّل

ایڈیٹر

علیگڈھ میگزین کی تازہ پیشکش حاضرِ خدمت ہے۔ یہ شمارہ مجازؔ مرحوم کے نام سے انتساب پاکر شائع ہو رہا ہے۔ اس کا حصہ اول مجازؔ کی شخصیت اور فن کے مطالعہ کے لئے وقف ہے۔ جوانامرگ مجازؔ کی موت سے علمی اور ادبی حلقوں اور بالخصوص نوجوانوں کو جو ٹھیس لگی ہے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ مجازؔ کے شعری ترانوں میں جو کیف و سرمستی، طبیعت کا جو بانکپن اور نظر کی جو سرشاری تھی وہ نئی پود کے لئے خاص کشش کا سامان رکھتی ہے۔ مجازؔ سے محرومی نے یہ اثر ڈالا گویا فضا میں کوئی ایسا نغمہ جو بہت دلنواز ہو کھو گیا اور طبیعت اس کے شوقِ طلب میں بے اختیار بے چین سی ہو گئی۔ علیگڈھ کے ساتھ مجازؔ مرحوم کے جو روابط تھے وہ صرف "ذاتی" قسم کے نہیں تھے۔ ان سے مجازؔ کی شاعری کو محرکات، موضاعات اور نگاہ کا آب و رنگ سب کچھ ملا۔ مجازؔ نے اپنے سخن کی صہبا میں علیگڈھ کی مستیٔ نظر اور مستیٔ کردار کی خوب خوب جلوہ نمائی کی ہے۔ ہمارے اوپر یہ فرض تھا کہ ہم اپنے جوانامرگ شاعر کی یاد میں صرف غم کے آنسو ہی نہ بہائیں بلکہ اس کے ادبی کارناموں کی قدر و قیمت متعین کریں اور اس کی شخصیت کے جادو اور فن کی ساحری کا بھی سراغ لگائیں ہمیں اس کا پورا احساس ہے کہ ہمیں اس سے کہیں زیادہ وسیع پیمانے پر یہ خدمت انجام دینا چاہئے تھی لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے جو کچھ ہو سکا وہ پیش کرنے کا فخر حاصل کر رہے ہیں۔

پچھلے برس ڈیڑھ برس میں اردو ادب "صیادِ اجل" کی بے خطا تیر اندازی کا جس طرح ہدف رہا ہے اس کی نظیر آسانی سے نہیں مل سکتی۔ ہماری بزم کے کیسے کیسے صاحبِ گفتار اور مجلسِ شعر و سخن کے کیسے کیسے نغمہ نواز دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کی بھری محفل کو چھوڑ راہ عدم اختیار کر گئے۔ خواجہ حسن نظامی، علامہ بیخودؔ دہلوی،

دتاتریہ کیفی، چراغ حسن حسرت، اقبال احمد سہیل، قاضی عبدالغفار، سعادت حسن منٹو، ہوش بگرامی، اسلم جیراج پوری، قاضی اختر جوناگڑھی، اعظم کریوی، علی منظور حیدرآبادی اور اسرارالحق مجاز۔ موت نے گویا اردو کا گھر دیکھ لیا ہے۔ ایک جمی جمائی محفل کو بے رونق کرنے پر تُل سی گئی ہے۔ جانے والوں پر چشم حسرت آنسو بہاتی ہے اور ان کی خالی جگہوں کو دیکھ کر دماغ حیران رہ جاتا ہے کہ اب یہ جگہ پُر کرنے والے ملیں گے کہاں سے؟

علیگڈھ کے رشتہ سے ہماری نگاہ اسرارالحق مجاز کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ مولانا اقبال احمد سہیل اور قاضی عبدالغفار پر پڑتی ہے۔ ان دونوں بزرگوں نے اردو ادب کی جو گراں مایہ خدمات انجام دی ہیں انھیں ادب کی تاریخ کبھی نہیں بھلا سکتی۔ مولانا اقبال احمد سہیل کی حیرت انگیز مہارت شعرگوئی اور ادیبانہ ژرف نگاہی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ مولانا ایم اے او کالج کی اعلیٰ ترین ادبی روائتوں کے حامل تھے۔ اور قریب چالیس برس تک وہ اپنی بے پناہ علمی صلاحیت اور شاعرانہ عظمت کا ثبوت دیتے رہے۔ قاضی عبدالغفار جن کی زندگی آخری دور میں اردو کی کشمکش حیات سے وابستہ ہوگئی تھی، علیگڈھ کے ان ہونہار فرزندوں میں سے تھے جنھوں نے اپنے ذہن کے نقوش ادب وتہذیب پر ہمیشہ کے لئے ثبت کردئے۔ ایک صاحب طرز انشاپرداز، ماہر فن صحافی، اور بالغ النظر مورخ کی حیثیت سے قاضی صاحب کو ادب میں جو مقام حاصل ہے اس سے قطع نظر اردو زبان کے لئے عملی جد وجہد کرنے والوں میں ان کا امتیاز خصوصی طور پر قابل لحاظ ہے۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ اسرارالحق مجاز ان بزرگوں کے سامنے نوعمر تھے اور ان کی خدمتِ ادب کا دائرہ بھی اتنا وسیع نہیں تھا۔ ہم نے کام کا آغاز اس کوشش سے کیا کہ زیر نظر شمارہ ایک خصوصی نمبر ہو جو علیگڈھ کے ان تین فرزندوں کی شخصیت وفن کے مطالعہ کے لئے وقف ہو۔ وقت کی تنگی نے ہمیں اخیر میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور کیا اور ہم نے اس شمارے کے ایک حصہ کو صرف مجاز کے لئے وقف کردیا دوسرے حصے میں علمی و ادبی اور تحقیقی مضامین اور نظمیں شامل کر کے اس شمارے کو مجاز کے نام سے معنون کردیا ہے۔ ہماری کوشش جاری ہے اور ہمیں پوری امید ہے کہ تعطیلات کے بعد علیگڈھ میگزین کا جو شمارہ شائع ہوگا وہ علامہ اقبال احمد سہیل مرحوم اور قاضی عبدالغفار مرحوم کی نذر ہوگا۔

یونیورسٹی کی زندگی میں یہ تعلیمی سال کئی حیثیتوں سے بہت ممتاز رہا۔ علی گڑھ کو نئے ہندوستان میں جو اہم تہذیبی اور اجتماعی کام انجام دینا ہے اس کا احساس اس سال کی تقریبوں میں خاص طور سے نمایاں ہوا۔ اسلامی دنیا کے دو خود مختار فرمانرواؤں کا ورود مسعود، قائد وطن پنڈت جواہرلال نہرو، ملک اور بیرون ملک کے نامور زعماء کی آمد اہم تعلیمی اور تہذیبی اداروں کی نشستیں، غرض مختلف حیثیتوں سے اس سال علیگڈھ بیرونی دنیا کے لئے مرکز نظر بنا رہا۔ نئے ہندوستان میں مشترک تہذیب کی صورت گری علیگڈھ کو ایک خاص نہج سے بڑے حسن نظر اور فراخ دلی کے ساتھ انجام دینا ہے۔ ایسی ہی تعمیر پر ملک کی پائیدار اور مستحکم ترقی کا بڑی حد تک مدار ہے۔ یہ ہے وہ حاصل جو ان تمام تقریبات کے نتیجے میں ظاہر ہو کر سامنے آیا۔ ہمیں کامل یقین ہے کہ ہمارے محبوب وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اپنی قائدانہ بصیرت اور حیرت انگیز تعلیمی تجربات کی روشنی میں علیگڈھ کی آیندہ ترقی کے جو خطوط قائم کر دئے ہیں وہ حال کی بہ نسبت کہیں زیادہ روشن تر نتائج کے ساتھ مستقبل قریب میں ارباب نظر سے داد و تحسین حاصل کریں گے اور دنیا دیکھ لے گی کہ ”بستان سید“ کے اس مرد باہمت نے ۱۹۴۷ء کے بعد شروع ہونے والے دور ابتلا میں نہ صرف علیگڈھ کے لئے استحکام زندگی کے روشن امکانات پیدا کئے بلکہ ہندوستان کی نئی تہذیبی اقدار و روایات کی ساخت و پرداخت میں اس کے ذوق نظر کی کتنی کار فرمائی ہے۔

علیگڈھ اور اردو کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایم اے او کالج کے دور قیام سے علم اور عرفان کا یہ مرکز اردو کی نشو و ترقی کے ساتھ خصوصی ربط رکھتا ہے۔ جدید اردو نثر کی بنیاد علیگڈھ تحریک کے بانی اور اُس کے رفقا کے ہاتھوں پڑی اور جدید نظم کو جولانی اور تگ و تاز کے وسیع میدان علیگڈھ تحریک ہی کے فیضان سے میسر آئے۔ سرسید اور محسن الملک کی مقالہ نگاری، حالی کی طرز جدید پر نظم گوئی اور سوانحی و تنقیدی خدمات، شبلی کا ذوق تحقیق و تاریخ، نذیر احمد کی خطابت، جدید اردو ادب کے یہ آب و رنگ علیگڈھ ہی کے فیضان کا پرتو ہیں۔ ان بزرگوں نے جو مستحکم ادبی روایات قائم کیں اور ادب میں حیات نو کا جو صور پھونکا اس کے اثرات محض ان کے دور تک محدود ہو کر نہیں رہ گئے۔ علیگڈھ کے ماحول میں اتنی نمو پذیری تھی کہ اس نے ارتقا کے تقاضوں کا پاس و لحاظ کرتے ہوئے ان روایاتِ نو کو نئے سے نئے قالب اور حسن و تزئین کے نئے سامان فراہم کئے۔ پچھلے

ستر پچھتر برس میں علیگڈھ نے جو ادیب اور شاعر پیدا کئے ان کے کارنامے کیا بہ لحاظ کمیت اور کیا بہ لحاظ کیفیت تاریخ ادب میں پائیدار قدر و قیمت حاصل کر چکے ہیں۔ سب سے زیادہ قابل لحاظ خدمت جو علیگڈھ نے اُردو ادب کی انجام دی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے ہمیشہ زندگی کے نئے تقاضوں کا ساتھ دیا اور ادب کے ذریعہ سے کاروانِ حیات کی رہبری کی۔ یہ واقعہ ہے کہ اجتماعیت کے زندہ احساس کے ساتھ انفرادیت کے نشو ونما کا جو آئیڈیل علیگڈھ نے پیش کیا ہے وہ ہندوستان کی کسی دوسری تعلیمی درسگاہ کے ہاتھوں سرانجام نہ پا سکا۔ علیگڈھ نے ہمیشہ اردو کی خدمت کو فرض سمجھ کر انجام دیا اور کبھی یہ تصور بھی پیدا نہ ہونے دیا کہ اردو صرف اسی کی جاگیر ہے۔ یہاں مختلف الخیال، مختلف العقائد دنیا کے مختلف حصوں سے آنے والے ہر دور اور ہر زمانے میں تہذیب اور تربیت ذہن کے کام میں بلند حوصلگی کے ساتھ شریک ہوئے اور حسن نظر اور حسن خیال کی تصویریں مختلف رنگوں کے خوشگوار امتزاج سے تیار ہوئی ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات میں سابقہ روایات کی بدولت علیگڈھ کی مرکزیت بڑی اہمیت کے ساتھ ابھر آئی ہے اور پورے ملک کی نگاہیں اردو کی ترویج اور ترقی کے لئے علیگڈھ پر لگی ہوئی ہیں۔ ہر عظیم ورثہ اپنے امینوں کے سامنے فرائض کا ایک وسیع میدان کھول دیتا ہے۔ یہی وہ احساس ہے جس سے علیگڈھ والے آج کل دوچار ہیں۔ ہم اس احساس کو نہ صرف ہندوستان کی ترقی کے لئے بلکہ اردو کے استحکام و بقا کیلئے فال نیک سمجھتے ہیں۔ نئے ہندوستان میں اردو کا سب سے بڑا مرکز علیگڈھ ہی ہو سکتا ہے ہمارے لئے یہ امر خصوصی طور پر وجہ مسرت ہے کہ ذاکر صاحب جن کی قیادت میں انجمن ترقی اُردو (ہند) نے اردو کے وجود و بقا کے لئے پچھلے سات آٹھ برس میں بڑے وقار کے ساتھ جد و جہد کی ہے یونیورسٹی میں بھی اردو کے کام کی وسیع پیمانے پر تنظیم کے لئے روز اول سے ساعی رہے ہیں۔ ابھی چند ماہ ہوئے مسٹر عطاء اللہ درّانی نے، جو ایم اے او کالج کے ایک ممتاز اولڈ بوائے اور ذاکر صاحب کے ایک مخلص دوست ہیں، یونیورسٹی کو پچیس ہزار روپے کا ایک عطیہ "سید حسین اردو ریسرچ چیر" کے قیام کے لئے مرحمت کیا۔ حال ہی میں درّانی صاحب علیگڈھ تشریف لائے اور اس کام کو مستحکم اور پائیدار کرنے کے لئے موصوف نے ڈیڑھ لاکھ ڈالر کا ایک مستقل فنڈ محفوظ کر کے اردو ادب کی وسیع اور اعلیٰ پیمانے پر خدمت کے لئے ایک نئی راہ کھول دی۔ ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ ہم درّانی صاحب کا اس

گراں قدر عطیہ پر مناسب طریقے سے شکریہ ادا کرسکیں ۔

ہمیں دلی مسرت ہے کہ "سید حسین ریسرچ چیر" پر اردو کے مشہور ادیب ، نقاد اور سخنور جناب آل احمد سرور صاحب بحیثیت پروفیسر مقرر ہوئے ہیں ۔ سرور صاحب ہمارے ادارے کے ایک ممتاز اولڈ بوائے ہیں ۔ ان کی اعلیٰ علمی ، تنقیدی اور تنظیمی صلاحیتوں کی پوری ادبی دنیا معترف ہے ہمیں یقین ہے کہ سرور صاحب کی مراجعت علی گڑھ سے اس ادارے میں وسیع پیمانے پر منظم ادبی خدمت کے لئے راہیں ہموار ہوں گی ۔ ہم محترم سرور صاحب کو اس اعزاز پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں ۔ ہمیں اس کا بھی یقین ہے کہ سرور صاحب بہت جلد ذاکر صاحب کی رہنمائی میں یونیورسٹی کے ارباب اختیار کی مدد سے "سید حسین ریسرچ چیر" کو ایک وسیع المقاصد اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی شکل دیدیں گے ۔ علیگڈھ سے اردو دنیا نے جو توقعات وابستہ کر رکھی ہیں ان کی ہمہ جہتی تکمیل کی راہ اسی انسٹی ٹیوٹ سے کھلے گی ۔

سال گذشتہ علیگڈھ میگزین کا خصوصی شمارہ "علی گڑھ نمبر" کے نام سے محترم نسیم قریشی صاحب کی ادارت میں شائع ہوا اس شمارے کا مقصد اشاعت ، علیگڈھ تحریک کے مختلف النوع پہلوؤں کا تنقیدی مطالعہ اور شخصیات علیگڈھ کے کارناموں کا جائزہ تھا ۔ کام جتنا اہم تھا اتنا ہی اس کا سرانجام دینا مشکل بھی تھا لیکن ہمیں فخر ہے کہ نسیم صاحب قریشی نے مسلسل تگ و دو سے اس خاص نمبر کو اتنے اہتمام اور اعلیٰ معیار پر شائع کیا کہ علمی اور ادبی حلقوں میں توقعات سے کہیں بڑھ کر اس کا خیر مقدم ہوا ۔ اس نمبر کی غیر معمولی مقبولیت سے اندازہ ہوا کہ علی گڑھ تحریک پر سیر حاصل جامع تصنیف کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی ہے ۔ یہ فرض علیگڈھ والوں ہی پر عائد ہوتا ہے اور ہمیں یہ معلوم کرکے دلی مسرت ہے کہ نسیم قریشی صاحب بہت جلد پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب اور پروفیسر آل احمد سرور صاحب کی نگرانی میں 'علی گڑھ نمبر' کو مناسب ترمیم و اضافے کے ساتھ ایک جامع تصنیف کی صورت میں پیش کرنے کے لئے کام شروع کر رہے ہیں امید ہے کہ یونیورسٹی فراخ حوصلگی کے ساتھ اعلیٰ پیمانے پر اس تصنیف کی اشاعت کا اہتمام کرے گی ۔

ہمیں اس کا بخوبی احساس ہے کہ اس شمارے کی تیاری بہت عجلت میں ہوئی ہے ۔ اور ہم جس پیمانے پر اس کام کو انجام دینا چاہتے تھے اس میں پورے طور پر کامیاب نہیں ہوسکے ہیں پھر بھی ہمیں مسرت ہے کہ ہم نے

اپنے بزرگوں کی عنایت اور دوستوں کی مدد سے اس کام کو جس طرح انجام دیا ہے وہ غالباً نگاہ پذیرائی کا مستحق ہی قرار پائے گا۔ اس شمارے کی تیاری میں جن بزرگوں اور دوستوں نے ہماری قلمی اعانت کی ہے ان کا شکریہ سب سے پہلے ہم اپنے اوپر واجب سمجھتے ہیں۔ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء کے ساتھ ساتھ جن کے مضامین اور نظمیں اس شمارے میں شائع ہو رہی ہیں ہم خصوصی طور پر بیرون علیگڑھ کے کرم فرماؤں، حضرت نیاز فتحپوری، نواب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی، پروفیسر سید احتشام حسین صاحب، حضرت سیکش اکبرآبادی اور محترمہ صالحہ عابد حسین کے ممنون کرم ہیں کہ ان کی قلمی اعانت نے ہمارے خواب کو عملی تعبیر دی۔

ہمارے لئے باعث فخر ہے کہ ہمیں یہ کام پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کی نگرانی میں انجام دینے کا موقع ملا۔ موصوف نے بڑی شفقت و عنایت سے ہماری رہنمائی کی اور ان کی نگہِ توجہ کا یہ فیضان ہے کہ ہم یہ کام انجام دے سکے۔ میگزین کے منیجر سید ظہیر الدین صاحب علوی نے فراخ دلی سے تمام ممکنہ سہولتیں فراہم کر کے اس شمارے کی اشاعت میں ہماری جو مدد فرمائی ہے اس کا اعتراف ہمارا خوشگوار فریضہ ہے ہمیں دلی مسرت ہے کہ اس سلسلے میں ہمیں پروفیسر آل احمد سرور صاحب کے کرم و عنایت سے بہرہ مند ہونے کا موقع ملا۔ موصوف کی ہمت افزائی اور بیش قیمت مشوروں سے ہمیں جو فائدہ ہوا اس کے لئے ہم تہ دل سے ان کے ممنون کرم ہیں۔ بڑی ناسپاسی ہوگی اگر ہم اپنے محترم نسیم قریشی صاحب کی اعانت و عنایت کا دلی اعتراف نہ کریں نسیم صاحب کی ہمہ وقتی حوصلہ افزائی، قیمتی مشوروں اور امداد و تعاون کے بغیر غالباً ہم یہ کام اتنی کم مدت میں خوش اسلوبی کے ساتھ انجام نہ دے سکتے۔ ہمیں مسرت ہے کہ ہمارے رفقائے ادارہ نے بڑی جوش و مستعدی سے اس کام کی تکمیل میں ہمارا ہاتھ بٹایا اور اس شمارے کی کامیابی کے لئے ہر طرح کوشش کی۔ آخر میں ہم سید انصار حسین صاحب منیجر سرفراز پریس لکھنؤ کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں جنھوں نے بڑے خلوص و مستعدی سے اپنی ذمہ داریوں کا بار اٹھایا اور بالکل صحیح وقت پر اس شمارہ کی اشاعت کرادی۔

اس احساس کے ساتھ کہ ہمارے ذوق خدمت کی ارباب نظر بہ خیال حوصلہ افزائی پذیرائی فرمائیں گے ہم یہ شمارہ ان کی جناب میں پیش کرتے ہیں۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار خوشۂ نارستہ در رگ تاک است

(عرفی)

اڈیٹر
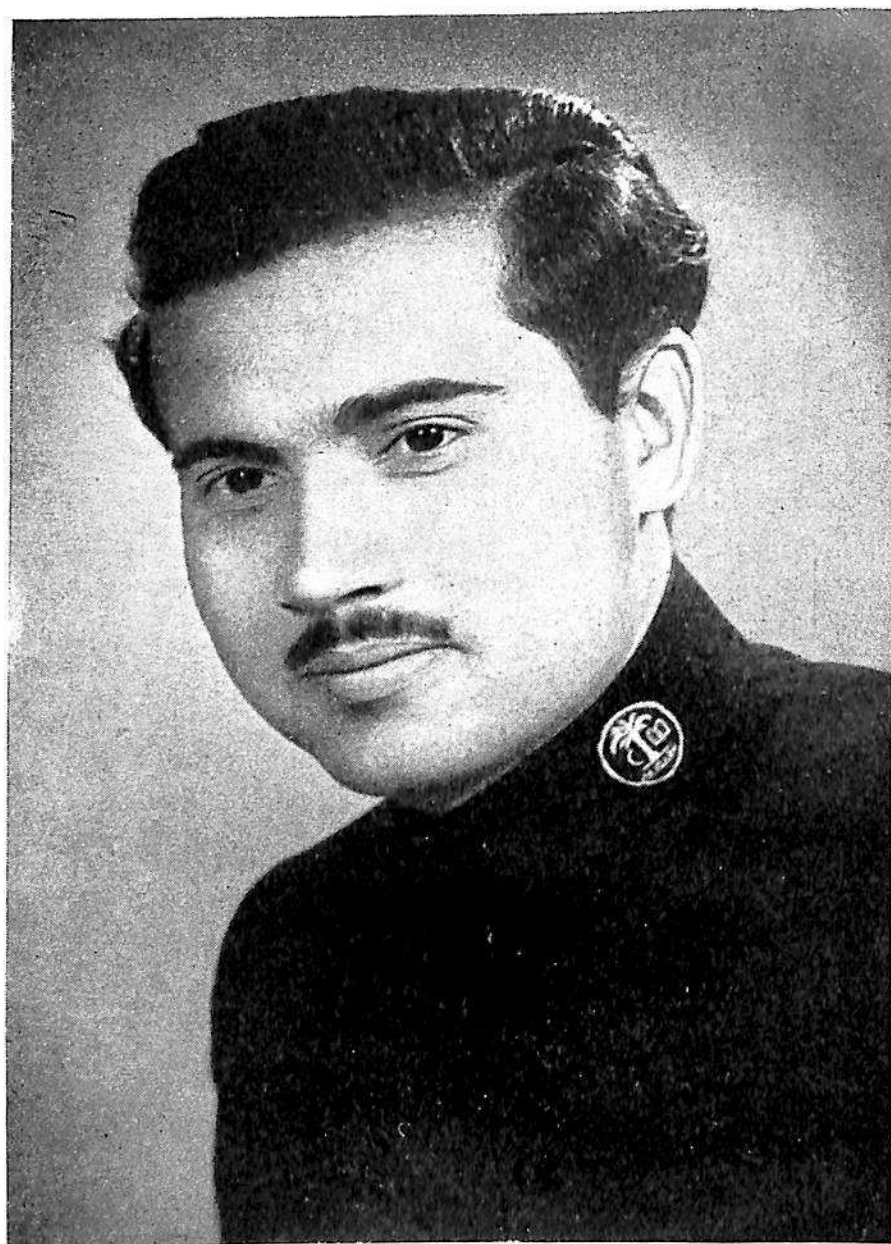
شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی

میں

سیّد حسین ادارۂ تحقیق کا قیام

جناب عطاء اللہ خاں صاحب درّانی (علیگ) کا گراں قدر عطیہ

جناب عطاء اللہ خاں صاحب درّانی (علیگ) نے اردو زبان و ادب کی تعمیری خدمت کے لئے ایک ایسا بیش قدر عطیہ مرحمت فرمایا ہے جس کی نظیر ہندوستان کے تعلیمی اداروں کی تاریخ میں بمشکل ملے گی۔ موصوف ایم۔ اے۔ او کالج کے ممتاز اولڈ بوائے، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے مخلص دوست اور ہم جماعت ہیں۔ موصوف نے اپنی ذہانت حسن تدبیر اور مسلسل محنت و عمل سے تجارت میں غیر معمولی فروغ حاصل کیا ہے۔ امریکی شہریت اختیار کر لینے کے باوصف موصوف مادر درسگاہ، ہندوستان اور وطن کی زبان و تہذیبی سرمایہ سے دلی شغف رکھتے ہیں۔ مطالعۂ کلام غالبؔ درّانی صاحب کا بڑا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ اور اجنبی فضاؤں میں غالبؔ ان کے ہمدم دیرینہ رہے ہیں۔ ان کی تمنا ہے کہ غالبؔ کی فکری عظمت کو بطریق احسن دانشوران مغرب سے روشناس کیا جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر موصوف نے سال گذشتہ کے وسط میں مسلم یونیورسٹی کو پچیس ہزار روپیہ کا ایک عطیہ ڈاکٹر سید حسین اردو ریسرچ چیئر کے قیام کے لئے مرحمت فرمایا۔

حال ہی میں درانی صاحب دوبارہ علی گڑھ تشریف لائے اور اس علمی و تحقیقی کام کو وسیع تر پیمانہ پر منظم و مستحکم کرنے کے لئے موصوف نے ڈیڑھ لاکھ ڈالر (تقریباً ساڑھے سات لاکھ روپیہ) کا ایک فنڈ سید حسین ادارۂ تحقیق کے لئے محفوظ کر دیا۔ درّانی صاحب نے اس گراں قدر عطیہ سے علی گڑھ کے نامور محب وطن فرزند ڈاکٹر سید حسین مرحوم کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے جو اقدام کیا ہے، وہ اکابر علم و ادب کی نظر میں ہمیشہ قدر و احترام کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

"سید حسین اردو ریسرچ چیر" پر ملک کے مشہور ادیب و نقاد جناب آل احمد صاحب سرور بحیثیت پروفیسر مقرر ہوئے ہیں۔ موصوف نے یکم دسمبر ۱۹۵۵ء سے اپنے نئے عہدہ کا چارج لیا ہے اور آج کل ادارہ کی تنظیم کے ساتھ ساتھ غالب کے مذاق شعر اور فکر و فن کو مغربی دنیا سے روشناس کرنے کے لئے مواد کی فراہمی اور غالب کے منتخب اشعار کا انگریزی میں ترجمہ کرنے میں مصروف ہیں۔

پروفیسر سرور کے ساتھ مسٹر نسیم قریشی مرتب "علی گڑھ نمبر" بحیثیت فیلو کام کر رہے ہیں۔ نسیم قریشی صاحب کے تحقیقی کام کا عنوان ہے "منشی نول کشور اور ان کا عہد" (مجوزہ درّانی صاحب) اور وہ سرور صاحب کی رہبری میں منشی نول کشور کی خدمات زبان و ادب اور نول کشور پریس کی تاریخ اور مطبوعات کے متعلق ایک مفصل جامع تصنیف کی تیاری میں مشغول ہیں۔

امید ہے یہ ادارہ بہت جلد اکابر علم و ادب کے حلقہ میں ممتاز مقام حاصل کرلے گا۔ اور علی گڑھ بحسن و خوبی ان بلند توقعات کو پورا کر سکے گا جو اردو دنیا نے جائز طور پر اس سے وابستہ کی ہیں۔

ادارہ

سید حسین ادارہ تحقیقات

شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی علیگڈھ
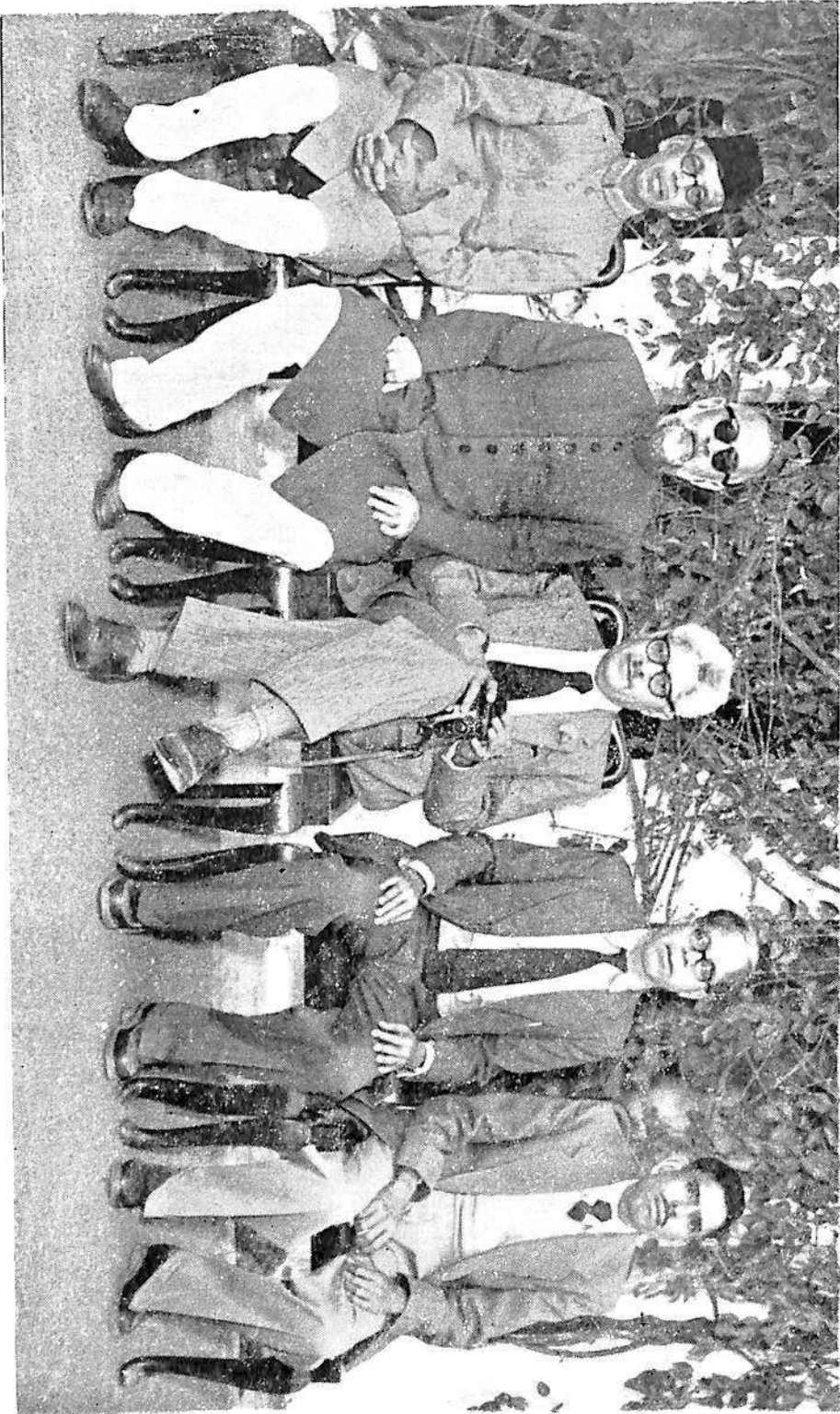
نسیم قریشی (ریسرچ فیلو) — پروفیسر آل احمد سرور (ریسرچ پروفیسر) — عطاءاللہ خاں درانی (معطی) — ڈاکٹر ذاکر حسین (وائس چانسلر) — پروفیسر رشید احمد صدیقی (صدر شعبۂ اردو)

حصّہ اوّل

مجاز

شخصیت، فکر، فن

"مجاز کے شعر میں تھکن نہیں مستی ہے، اداسی نہیں، سرخوشی ہے۔ مجاز کی انقلابیت عام انقلابی شاعروں سے مختلف ہے۔ عام انقلابی شاعر انقلاب کے متعلق گرجتے ہیں للکارتے ہیں سینہ کوٹتے ہیں۔ انقلاب کے متعلق گا نہیں سکتے ان کے ذہن میں آمد انقلاب کا تصور طوفانِ برق و رعد سے مرکب ہے نغمہ ہزار اور رنگینی بہار سے عبارت نہیں ۔ وہ صرف انقلاب کی ہولنا کی کو دیکھتے ہیں اس کے حسن کو نہیں پہچانتے"

فیض احمد فیضؔ

مجاز — رومانیت کا شہید

پروفیسر آل احمد سرور

اپنے ہم عصروں میں جو مقبولیت مجاز کو حاصل ہوئی وہ کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔ مجاز نے تقریباً پچیس سال شاعری کی۔ اس طویل عرصے کو دیکھتے ہوئے اُن کا مجموعۂ کلام بہت مختصر ہے۔ اُن کی بہترین نظمیں بیشتر ۱۹۳۵ء اور ۱۹۴۵ء کے درمیان کی ہیں۔ اِدھر چار پانچ سال میں اُنھوں نے مشکل سے کچھ کہا ہوگا۔ خود کہتے تھے کہ شعر کی دیوی مجھ سے روٹھ گئی ہے۔ اتنا کم سرمایہ لے کر بہت کم لوگ بقائے دوام کے دربار میں داخل ہوئے ہوں گے۔

مجاز کو نہ تو علم وفضل میں کوئی کمال حاصل رہا، نہ انھوں نے کسی بڑی تحریک سے عملی دلچسپی لی۔ ذہنی طور پر وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے مگر اس قید میں انھوں نے خاصی آزادی روا رکھی۔ مجاز نہ غیر معمولی طالب علم تھے، نہ دنیوی اعتبار سے کامیاب ثابت ہوئے۔ آنے والی نسلوں کو شاید اس بات پر حیرت ہو کہ مجاز اپنے زمانے میں کیوں اِس قدر محبوب تھے۔ شراب نے مجاز کو کہیں کا نہ رکھا۔ ریاض نے تو رسمی طور پر خمریات کا یہ شعر کہا تھا ؎

اچھی پی لی خراب پی لی جیسی پائی شراب پی لی

مگر مجاز نے اس پر برابر عمل کیا۔ اِسی کی وجہ سے اُن کی صحت خراب ہوئی۔ اِسی نے اُن کو دیوانگی کی حد تک پہنچا دیا۔ اِسی نے بالآخر اُن کی جان لی۔ مرنے کے پانچ مہینے پہلے مجاز میرے ساتھ کشمیر میں تھے۔ کشمیر کے دلکش مناظر کو دیکھ کر وہ شخص بھی جو جمالیاتی ذوق سے بالکل عاری ہو، کچھ دیر کے لئے شاعر بن جاتا ہے۔ مجاز ان سے بھی یونہی گزر گئے۔ کبھی کبھار اُن کی فطری زندہ دلی عود کر آتی تھی اور بس۔ مگر مجاز کی محبوبیت اور مقبولیت ان سب باتوں کے باوجود کسی وقت ماند نہیں ہوئی۔ مجاز کی حالت پر افسوس

ہوتا تھا، دل کڑھتا تھا، کبھی کبھی جھنجلاہٹ بھی ہوتی تھی، مگر اُن پر غصہ کبھی نہیں آیا۔ آ بھی نہیں سکتا تھا۔
مجاز مرنے کے وقت پینتالیس چھیالیس سال کے تھے۔ میں اُنھیں سنہ ۱۹۲۹ء سے جانتا تھا جب وہ اور جذبی جو اُس وقت ملالؔ تخلص کرتے تھے فرسٹ ایر سائنس میں سینٹ جانس کالج آگرہ میں داخل ہوئے۔ میں اُن سے ایک سال آگے تھا۔ کالج کے مشاعروں میں دونوں شریک ہوتے تھے۔ غالباً سنہ ۱۹۳۱ء میں مجاز کو ایک انعامی مقابلے میں پہلا انعام بھی ملا تھا۔ مجاز کو اُس زمانے میں ٹینس سے خاص دلچسپی تھی اور سکنڈ ٹینٹ کے ممبر ہو گئے تھے۔ فانی اور سیکش اکبر آبادی سے اُسی زمانے میں اُن کا ربط ضبط بڑھا۔ فانی نے اُن کی چند غزلوں پر اصلاح بھی دی تھی۔ اُس کے بعد انھوں نے اپنے ذوق ہی کو رہبر بنایا۔ میں جب سنہ ۱۹۳۲ء میں ایم۔ اے کرنے علی گڑھ آیا تو مجاز یہاں سال بھر سے موجود تھے۔ سائنس اُن سے نہ چلی اس لئے اُنھوں نے آرٹس میں داخلہ لیا اور سنہ ۱۹۳۵ء میں بی۔ اے کر لیا۔ انگریزی اور فلسفہ کے علاوہ ایک مضمون اور لیا تھا جو اِس وقت ذہن میں نہیں۔ اس زمانے میں اُن کا زیادہ وقت، دوستوں کے کمروں پر گزرتا تھا۔ ان میں جاں نثار اختر، اختر امام اور حامد جو ٹینس کے اچھے کھلاڑی تھے، یاد آتے ہیں۔ دسمبر سنہ ۱۹۳۲ء میں انجمن حدیقۃ الشعر کا سالانہ مشاعرہ ہوا تھا جس کی صدارت سر راس مسعود وائس چانسلر نے کی تھی اور جس میں مولانا حسرت، اصغر گونڈوی اور حفیظ جالندھری بھی شریک ہوئے تھے۔ طلباء کے لئے اس میں نظم کا ایک عنوان 'صبح بہار' رکھا گیا تھا۔ مجاز کی نظم پر شروع میں حسب معمول ہوٹنگ ہوئی مگر بعد میں اس کی رنگینی اور دلکشی اور پڑھنے والے کے پرسوز ترنم نے داد بھی حاصل کی تھی۔ یہ مجاز کا علی گڈھ سے پہلا تعارف تھا۔

جاں نثار اختر سے سب سے پہلے مجھے مجاز نے ہی ملایا تھا۔ علی گڈھ میگزین کی ادارت کے لئے اسکے نگراں خواجہ منظور حسین صاحب سے اُنھوں نے ہی ملنے پر زور دیا تھا۔ میری ادارت کے زمانے میں مجاز کی نظم 'نمائش'، ایک غزل اور 'انقلاب' اِسی میگزین میں چھپیں۔

اُس زمانے میں بھی مجاز ایک مخلص دوست اور ایک زندہ دل رفیق کی حیثیت سے ممتاز تھے۔ نوجوان طلبا کا محبوب مشغلہ اسٹیشن کی سیر، یا نمائش کے زمانے میں نمائش کے چکر تھے۔ گھنٹوں لوگ اِدھر سے اُدھر ٹہلتے تھے۔ خریداری سے کوئی مطلب نہ تھا ذوق نظر کی تسکین کافی تھی۔ "نمایش" اس زمانے کے تند و تیز اور والہانہ جذبات کی یادگار رہے۔

اِسی زمانے میں علی گڈھ میں نئے خیالات کی رَو شروع ہوئی۔ ڈاکٹر اشرف یورپ سے واپس

آ گئے تھے۔ اختر رائے پوری بی۔اے کرنے گے لئے آفتاب ہوسٹل میں مقیم تھے۔ وہیں سبط حسن بھی تھے۔
اختر رائے پوری نے اپنا مضمون "ادب اور زندگی" اسی زمانے میں لکھا تھا جب وہ رشید صاحب کے یہاں
مقیم تھے۔ سبط حسن کے بعض ترجمے اور حیات اللہ انصاری کی کہانیاں بھی میں نے علی گڈھ میگزین میں
شایع کی تھیں۔ سجاد ظہیر آکسفورڈ میں ایک طویل عرصے تک قیام کرنے کے بعد علی گڈھ بھی آئے تھے۔
انگارے شایع ہوتے ہی ضبط ہو چکی تھی۔ میں نے میگزین میں اُس پر سخت تنقید کی۔ خواجہ منظور حسین صاحب
نگراں تھے۔ وہ انگارے کو بعض ادبی تجربات کی وجہ سے پسند کرتے تھے۔ میرا مضمون اُنھیں پسند نہ آیا مگر
اُنھوں نے اس پر احتساب نہ کیا۔ یہ باتیں اِس لئے لکھ رہا ہوں کہ نئے خیالات کی اِس رَو کا اثر مجاز پر بھی
ہوا اور 'نمایش' اور 'صبحِ بہار' کا لکھنے والا، انقلاب کا نقیب بن گیا۔

جب ۱۹۳۵ میں آل انڈیا ریڈیو کا قیام وجود میں آیا تو ایک انگریز فیلڈن کا تقرر بحیثیت ڈائرکٹر
ہوا۔ یہ بڑا غیر معمولی آدمی تھا۔ سرکاری اور دفتری نظام سے سخت بیزار اور اہلِ علم کا بڑا قدر داں۔ ایک دفعہ
لاہور میں تھا۔ صوبے کے گورنر سے مل چکا تھا اور اقبال سے ملنے جا رہا تھا۔ اپنے ایک ملاقاتی سے کہنے لگا
کہ میں لاہور کے سب سے چھوٹے آدمی سے مل کر آ رہا ہوں اور سب سے بڑے آدمی سے ملنے جا رہا ہوں۔ اس نے
ریڈیو میں تقریرات کرنے کے لئے رشید احمد صدیقی صاحب کو علی گڈھ سے اور پروفیسر بخاری کو لاہور سے
بلایا۔ ابتدائی تقرریات میں زیڈ۔ اے۔ بخاری، آغا اشرف اور مجاز لئے گئے۔ مجاز کے سپرد ریڈیو کے
رسالے آواز کی ادارت ہوئی۔

پروفیسر بخاری کچھ عرصے بعد فیلڈن کے نائب کی حیثیت سے دہلی آ گئے۔ اُن میں اور دہلی والوں
میں چشمک شروع ہوئی آغا اشرف نے مجاز کو ملا لیا۔ آغا اشرف کا تو کچھ نہ بگڑا۔ بخاری نے اُن کا تنزل
کر دیا، مجاز کو علیحدہ کر دیا گیا۔ رشید صاحب نے بخاری کو سمجھایا مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ اِسی زمانے
میں مجاز ادبی حلقوں میں خاصے مقبول ہو چکے تھے۔ وہ طبعاً سازشی آدمی نہ تھے مگر اُنھیں یہ غلط فہمی ہو چکی تھی
کہ ادبی اہمیت کی بنا پر ملازمت پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ اشرف صاف نکل گئے، غریب مجاز اپنی سادہ لوحی کا
شکار ہو گیا۔

۱۹۳۶ء میں علی گڈھ میں ایک اُردو کانفرنس ہوئی۔ مولوی عبدالحق صاحب انجمن کا دفتر دہلی
منتقل کرنا چاہتے تھے اور انجمن کے کام کو پھیلانا اور بڑھانا چاہتے تھے۔ یہ بڑا شاندار اجتماع تھا۔ مجھے

اچھی طرح یاد ہے کہ مجاز آئے تو دہلی کی ملازمت ختم ہو چکی تھی۔ استفسار حال پر انھوں نے اقبال کا یہ شعر پڑھا ؎

اگر لٹ گیا اک نشیمن تو کیا غم   مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

اسی کانفرنس کے دوران میں یونین میں معزز مہمانوں کا خیر مقدم تھا۔ پنڈت کیفی نے 'اُردو ہماری زبان' کے نام سے ایک مقالہ پڑھا۔ پنڈت کیفی کی آواز پست تھی۔ مایک کا رواج اُس وقت تک نہ تھا۔ ہال میں خوب شور ہوا۔ غرض جوں توں کر کے مقالہ ختم ہوا تو صدر نے اعلان کیا کہ اب اسرار الحق مجاز ایک نظم سنائیں گے۔ مجاز نے اپنی دل نشین پرسوز آواز میں "نذر علی گڈھ" شروع کی مجمع پر ایک بے خودی سی چھا گئی۔ لوگ جھوم جھوم اُٹھے۔ جب وہ اس شعر پر پہنچے ؎

آ آ کے ہزاروں بار یہاں خود آگ بھی ہم نے لگائی ہے

پھر سارے جہاں نے دیکھا ہے، یہ آگ ہمیں نے بجھائی ہے

تو ہر طرف سے بے اختیار نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے۔ ڈایس پر ڈاکٹر ذاکر حسین، عبدالرحمٰن صدیقی اور مولوی عبدالحق صاحب تشریف فرما تھے ذاکر صاحب نے بے ساختہ کہا، مجاز صاحب پھر پڑھئے۔ اسی زمانے میں علی گڈھ کے ارباب حل و عقد اولڈ بوائز پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ خلافت کے زمانے کی طرح پھر علی گڈھ کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ مجاز کے اس شعر میں اس کا جواب بھی تھا۔

یہ زمانہ مجاز کی شاعری کا بہترین زمانہ تھا۔ اُن کی مقبولیت اپنے شباب پر تھی عصمت چغتائی نے اس کا ذکر اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے۔ مجاز میں قوت ارادی کی کمی شروع سے تھی۔ دوستوں کی واہ واہ، حسین خواتین کی داد، مشاعروں میں مقبولیت نے ایک نشے کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ اسی زمانے میں شراب کا شغل بھی ہونے لگا۔ مجاز علی گڈھ سے لکھنؤ پہنچے اور کئی سال وہاں قیام رہا۔ جوش سے ربط ضبط شروع ہوا یہ اکثر جوش کے ساتھ دیکھے جانے لگے۔ جوش کا فرض تھا کہ مجاز کو بہکنے نہ دیتے۔ مگر 'قبلۂ رندانِ جہاں' کو اپنی ذمہ داری کا کب احساس تھا۔ کچھ زمانہ اسی طرح گذرا۔ اب تک دل پر جو زخم آئے تھے وہ ذرا ہلکے تھے مگر دہلی میں ایک زخم ایسا کاری لگا کہ اس کی چوٹ ساری عمر نہ گئی۔ شروع میں دلنوازی اور لطف و کرم، سب کچھ تھا، مگر مجاز کچھ اس سے زیادہ چاہتے تھے۔ آخر مایوسی ہوئی مگر مجاز کی خوبی یہ تھی کہ افسردگی کے باوجود لہجے میں تلخی نہ آئی۔ لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں جوش، سجاد ظہیر، سردار جعفری، سبط حسن، حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر عبدالعلیم، احمد علی اور احتشام حسین کا

ساتھ رہا۔ ان میں سوائے جوش کے شاعری کسی اور کا اوڑھنا بچھونا نہ تھا۔ ان سب کا ایک سنجیدہ مقصد تھا۔ 'نیا ادب' کی ادارت میں مجاز بھی شریک تھے۔ یہ پرچہ ترقی پسند تحریک کا نقیب تھا۔ مجاز کا تعلق اس سے ذہنی زیادہ تھا عملی کم۔ پھر لکھنؤ سے اخبار 'ہندوستان' نکلا۔ اس میں 'اندھیری رات کا مسافر' اور 'سرمایہ داری' جیسی نظمیں شایع ہوئیں۔ 'ساقی' کے سالنامے میں 'آوارہ' نکلی۔ ترقی پسندوں میں اس وقت ایک باغیانہ جوش تھا۔ انقلاب کا ایک رومانی اور طفلانہ تصور تھا۔ ماضی کے شاندار سرمائے سے یکسر بغاوت تھی۔ تہذیب و اخلاق فرسودہ تصور کئے جانے لگے تھے۔ مجاز پر ان خیالات کا گہرا اثر ہوا۔ قدیم شعرا سے واقفیت اور ابتدائی تعلیم و تربیت نے اُنھیں یکسر باغی ہونے سے بچا لیا۔ نعرہ بازی اور سیاسی پروپیگنڈا اُن کے یہاں بھی ہے مگر بہت کم۔ جوش سے وہ متاثر ضرور ہیں مگر اُن کے مقلد نہیں۔ فیض نے ٹھیک کہا ہے کہ وہ انقلاب کے ڈھنڈورچی نہیں، اُس کے مغنی ہیں۔ اس دَور کی سب سے اچھی نظم 'آوارہ' ہے۔ یہ ایک نسل کے درد و داغ کی کہانی ہے اس کی آرزو اور جستجو، اُس کی محرومی اور سرشاری کی علامت ہے۔ یہاں ذاتی تجربات ایک دور کی داستان بن گئے ہیں۔

۱۹۴۲ تک مجاز کی سرشاری کا دَور رہا۔ اس کے بعد یہ نشہ اُترنے لگا۔ زندگی کے حقائق نے انتقام لیا۔ دوست جو شروع میں دل کھول کر پذیرائی کرتے تھے، کچھ کنی کاٹنے لگے۔ مجاز اب ایک طفیلی تھے اور شاعری سے بہرحال ذہن کی آگ بجھے تو بجھے پیٹ کی آگ تو نہیں بجھتی۔ چنانچہ تنگ آکر نوکری کی جستجو کی۔ بالآخر ہارڈنگ لائبریری دہلی میں ایک جگہ مل گئی۔ ایک طرف مشاعروں کی مقبولیت اور اونچے سے اونچے گھرانوں کی واہ واہ تھی، دوسری طرف ایک کلرک کی زندگی کے مصائب۔ مجاز بیچارے کا کیا قصور۔ بیک وقت آسمان پر پرواز اور وہاں سے فوراً دھرتی پر پٹخ دیا جانا، پھر آسمان کی سیر اور پھر سنگلاخ حقائق کا بوجھ، ایک نازک طبع، کمزور دل کا نوجوان جس کے دل پر کتنے ہی زخم تھے اور جس کی جیب خالی تھی، مگر جو تہذیب اور شرافت کے ایک معیار کو فراموش نہ کر سکتا تھا، کیسے برداشت کرتا۔ چنانچہ خلل دماغ شروع ہوا۔ باتیں اور بے تکان باتیں کرنے کا مرض پیدا ہو گیا۔ ان میں کچھ اپنی تعریف تھی، کچھ لطیفے تھے، کچھ شعر و ادب پر اُلٹی سیدھی باتیں تھیں۔ بارے نینی تال کے قیام سے طبیعت کچھ سنبھلی۔ طبیعت میں ایک ٹھیراؤ پیدا ہوا۔ یہ فکر ہوئی کہ روٹی تو کسی طرح کما کھائے مچھندر۔ چنانچہ بمبئی کا رخ کیا۔ فلمی گانوں سے بہت سے شعرا اچھا خاصا کما لیتے تھے، مگر مجاز اس دنیا کی کاروباری

زندگی اور زمانہ سازی کے لئے نہ بنے تھے ۔ چنانچہ وہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ۔ ایسے عالم میں شراب ایک پناہ بن گئی ۔ اب مجاز بالکل رندِ خراباتی بن گئے ۔ مشاعروں میں آتے تو اکثر بدمست ہوتے ۔ جو لوگ شعر سننے آتے تھے انھیں بدمستی کے مظاہرے بھی سہنے پڑتے ، مگر وہ طبعاً اتنے مخلص ، نیک ، محبت کرنے والے اور وضعدار تھے کہ ان کی بدمستی سے انھیں کو نقصان پہنچا ، انھوں نے کسی کو نقصان نہیں پہنچایا ۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں مجاز علی گڈھ سے لکھنؤ چلے گئے تھے ۔ میں سنہ ۱۹۴۵ء تک علی گڈھ میں رہا ۔ ڈیڑھ سال کے لئے رام پور گیا تھا ۔ وہاں سے سنہ ۱۹۴۶ء کے وسط میں لکھنؤ پہنچا ۔ اتنے عرصے میں مجاز سے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوئی تھی ۔ اس کے بعد لکھنؤ میں اکثر ملاقات ہوتی ۔ وہ کافی ہاؤس خاص پابندی سے آتے تھے ۔ میں کبھی کبھار پہنچتا ۔ یونیورسٹی کے ادبی جلسوں میں طلبا مجاز کو بڑے شوق سے بلاتے اور وہ ان کی دعوت کو کبھی رد نہ کرتے ۔ سنہ ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد جو واقعات رونما ہوئے ان کا اثر مجاز پر بھی ہوا ۔ انھوں نے نہ تو آزادی کو ہر خواب کی تعبیر سمجھا اور نہ اسے جھوٹی آزادی قرار دیا ۔ جشنِ آزادی میں کہتے ہیں ؎

یہ انقلاب کا مژدہ ہے انقلاب نہیں　　　یہ آفتاب کا پرتو ہے آفتاب نہیں
وہ جس کی تاب و توانائی کا جواب نہیں　　　ابھی وہ سعیِ جنوں خیز کامیاب نہیں
یہ انتہا نہیں آغازِ کارِ مرداں ہے

وہ بڑے درد سے پوچھتے ہیں

سبزۂ و برگ و لالہ و سرو و سمن کو کیا ہوا　　　سارا چمن اداس ہے ہائے چمن کو کیا ہوا

مگر اب مجاز بہت کم کہنے لگے تھے ۔ شراب نے ان کی صحت تباہ کر رکھی تھی ۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں وہ اپنی غنودگی سے کچھ چونکے اور "فکر" جیسی نظم اور "جنونِ عشق اب بھی کم نہیں ہے" جیسی غزل کہی ۔ اس کے بعد وہ خاصے سنبھلے ہوئے تھے ۔ انھیں یہ احساس ہو چلا تھا کہ کوئی سنجیدہ کام کرنا چاہئے ۔ اردو میں ایم ۔ اے کرنے کا ارادہ تھا ۔ ان کے سارے احباب کو مسرت تھی کہ اب مجاز راہِ اعتدال پر آ رہے ہیں ۔ مگر قسمت کو کچھ اور منظور تھا ۔ اجمیر اور دہلی کے مشاعروں میں شرکت کے بعد اور وہاں کی رنگین محفلوں میں شرکت کے بعد ان کا دماغی توازن بگڑ گیا اور انھیں ان کے اعزّا نے رانچی پہنچا دیا ۔

رانچی میں تقریباً چھ مہینے رہنے کے بعد وہ آئے تو بالکل ٹھیک تھے ۔ سہیل عظیم آبادی ان کے ساتھ تھے ۔ مجھ سے ملنے آئے تو کہنے لگے "سرور صاحب ابکی رانچی میں میں نے ایک ریسرچ کی ہے ۔ شراب سے

نشہ نہیں ہوتا، آدمی پاگل ہوجاتا ہے۔" شراب بالکل چھوڑ دی تھی۔ اُن کے غیر ذمہ دار دوست اصرار بھی کرتے تو معذرت کر دیتے تھے۔ اسی زمانے میں اُن کی بہن صفیہ کا ایک طویل علالت کے بعد انتقال ہوا۔ مجاز پر اس کا بہت اثر ہوا۔ ہفتوں گھر سے باہر نہ نکلے۔ صفیہ کے بچوں کا دل بہلاتے رہتے تھے مگر چند مہینے کے بعد پھر شراب کی کشش غالب آئی اور اب کی وہ اس میں بالکل غرق ہو گئے۔

جولائی ۱۹۵۵ء میں ریڈیو سری نگر کے ایک مشاعرے میں شرکت کرنے کے لئے میں بھی گیا اور مجاز بھی۔ دوستوں نے مجاز کی اس طرح دیکھ بھال کی جیسے کسی بہت قیمتی اور نازک چیز کی۔ ہم لوگ اُنھیں گلمرگ اور سری نگر کے شاہی باغات دکھانے لے گئے۔ مجاز اتنے بُجھ گئے تھے کہ ان پر کسی چیز کا اثر نہ ہوتا تھا۔ نشاط اور شالامار میں بکثرت فوارے ہیں۔ ان فواروں میں پانی اتنے زور سے چلتا ہے کہ اگر کوئی لیمو فوارے کے مُنہ پر رکھ دیا جائے تو کچھ دیر کے لئے پانی کے زور سے ہوا میں معلق ہو جاتا ہے۔ ایک دوست یہ کھیل کر رہے تھے کہ ایک پنجابی عورت نے کہا "اللہ دی قدرت ہے۔" مجاز کو اس جملے نے بہت محظوظ کیا۔ شالامار اور نشاط کے تاثرات کا حاصل مجاز کے نزدیک یہ لطیفہ تھا۔

مجاز سے آخری ملاقات نومبر کے آخری ہفتے میں ہوئی۔ میں علی گڈھ آنے والا تھا۔ ایک رخصتی دعوت میں مجاز بھی تھے۔ کہنے لگے "سرور صاحب۔ یہ بہت اچھا ہے کہ آپ علی گڈھ جا رہے ہیں۔ وہاں جو بات ہے کہیں نہیں۔ میں بھی آؤں گا۔ مجھے "نذر علی گڈھ" بھی سننا ہے جسے یونین والوں نے اپنا ترانہ بنایا ہے۔ ذرا یہ طلبا کا اُردو کنونشن ہولے تو میں بھی علی گڈھ کا قصد کروں۔" طلبا کا کنونشن ہوا مشاعرے میں مجاز نے بڑے جوش سے اپنا کلام سنایا اور دوسرے دن اتنی شراب پی کہ اُن کے دماغ کی رگیں پھٹ گئیں۔ علی گڈھ آنے سے پہلے وہ دوسری دنیا میں پہنچ گئے۔ یہ ہے اُردو کے کیٹس کا المیہ۔

مجاز کی شخصیت کے متعلق بھی اپنے تاثرات بیان کر دوں۔ مجاز سر تا پا شاعر تھا۔ خوابوں کی دنیا کا رہنے والا، زندگی کے تلخ حقائق کا علاج مجبوراً شراب میں ڈھونڈھتا تھا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت نے اُسے شرافت، تہذیب، حُسنِ معاشرت کے کچھ معیار دئے تھے۔ طبیعت میں اتنی مضبوطی نہ تھی کہ ان کی خاطر یا اُن معیاروں کی خاطر جو ایک علمی و ادبی تحریک سے وابستگی کی وجہ سے اُس نے قبول کر لئے تھے، وہ ریاض کرتا۔ وہ رند تھا۔ اس میں عاشق کا ولولہ تھا، مجاہد کے کردار کی صلابت نہ تھی۔ اسکی ابتدائی تربیت نے جو نقش دل میں بٹھا دئے تھے اُنھیں وہ محو نہ کرسکا۔ نئے رنگ کا جو نشہ چڑھ گیا تھا وہ

اُتر نہ سکا۔ اس کشمکش نے اسے جہادِ زندگی میں اپنا راستہ نکالنے کے بجائے ناکامی و نامرادی کے راستے پر لگا دیا۔ مگر اُس کے کردار کی خوبی یہ ہے کہ مردم بیزار یا تلخ یا قنوطی کبھی نہیں ہوا۔ پیہم ناکامیوں کو جھیلنے یا بھلانے کی کوشش کرتا رہا۔ کبھی لطیفوں میں کبھی شراب میں۔ اُس کے دو تین لطیفے مجھ سے سُنئے جو میرے سامنے کے ہیں۔

ایک دفعہ مجازؔ اور جذبیؔ لکھنؤ میں میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اس دور کے ایک مشہور شاعر ملنے آئے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ "سرور صاحب! سوچتا ہوں شادی کرلوں" مجھے یہ سُن کر تعجب ہوا۔ میں اُنھیں شادی شدہ سمجھتا تھا۔ پھر کہنے لگے "اور سوچتا ہوں کسی بیوہ سے کروں"۔ اب تک یہ باتیں صرف میں سُن رہا تھا کیونکہ مجازؔ اور جذبیؔ ایک دوسرے سے کچھ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میں نے یہ گوارا نہ کیا کہ ایسی مزے دار گفتگو میں دوسرے شریک نہ ہوں۔ چنانچہ میں نے مجازؔ کو متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ "یہ صاحب شادی کرنے والے ہیں اور کسی بیوہ سے کرنے کا خیال ہے" مجازؔ نے بے ساختہ کہا "حضرت آپ سوچئے نہیں کر لیجیے۔ بیوہ تو آپ سے شادی کے بعد وہ ہو ہی جائے گی"۔

سلام مچھلی شہری کو ایک زمانے میں لمبے لمبے منظوم خط لکھنے کی دُھن تھی۔ سجاد ظہیر اور کرشن چندر کو لکھ چکے تھے۔ کافی ہاؤس میں ایک دفعہ اسی کا تذکرہ تھا۔ ایک نہایت مختصر قسم کے آدمی تھے۔ بھُبنیشور (BHUNESHWAR) خدا جانے اب کہاں ہیں۔ ہندی کے بہت اچھے لیکھک۔ اُردو بھی خوب جانتے تھے۔ کسی کو خاطر میں کم لاتے تھے۔ اُنھوں نے کہا سلام صاحب آپ میرے نام خط کب لکھ رہے ہیں۔ مجازؔ نے کہا "تمھیں اتنا لمبا خط کیا لکھیں گے، ایک پوسٹ کارڈ ڈال دیں گے"۔

بقر عید کے موقع پر لکھنؤ ریڈیو سے ایک چھوٹا سا مشاعرہ تھا۔ مجازؔ نے عرصے سے کچھ نہ کہا تھا، شرط یہ رکھی گئی تھی کہ نئی چیز ہوگی۔ مجازؔ پریشان تھے۔ میں نے مشاعرے کے دن اُن سے پوچھا۔ کہو بھئی آج تو تمھاری قربانی ہے، کہنے لگے "سرور صاحب قربانی نہیں جھٹکا کہیے"۔

آخر آخر میں مجازؔ کا یہ رنگ بہت ماند ہو گیا تھا مگر خاکستر میں سے کبھی کبھی چنگاریاں نکل ہی آتی تھیں۔

مجازؔ نے کبھی کوئی ٹولی نہیں بنائی۔ شہرت کے لئے اُس نے کوئی جال نہیں بچھایا۔ ہم عصروں میں سے ہر ایک سے اُسی کی سطح پر ملتا رہا۔ اس کے دوستوں میں ہر مشرب اور مسلک کے آدمی تھے۔

ایک کی برائی دوسرے سے کرنا اُس کا شعار نہ تھا، وہ سب کا دوست تھا۔ صرف اپنا دشمن تھا۔ ماحول نے اس کے ساتھ بے حسی اور بے پروائی برتی۔ مگر اس نے ماحول کی شکایت بھی نہیں کی۔ اس میں بڑا ظرف تھا۔ اُس نے کسی کے سامنے ہاتھ بھی نہیں پھیلایا۔ نشے کے عالم کی بات دوسری ہے۔ اس عالم میں اکثر لوگ ناقابلِ برداشت ہوجاتے ہیں۔ آخر میں مجاز کی بھی یہ کیفیت ہوگئی تھی۔ مگر نشے میں ایک دفعہ جو اُس نے کیا، میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ ایک دفعہ ڈاکٹر علیم۔ احتشام اور مَیں ایک اُردو کانفرنس میں شرکت کے لئے پٹنے گئے۔ مجاز بھی ساتھ تھے۔ ایک ڈبے میں صرف تین برتھ خالی تھے۔ مجاز کو دوسرے ڈبے میں جانا پڑا۔ جلد ہی لوٹ آئے۔ میں نے پوچھا کیا ہوا۔ کہنے لگے وہاں ایک سردار جی کرپان لئے میرے منتظر تھے۔ چنانچہ میں نے شاندار پسپائی میں ہی نجات سمجھی۔ فرش پر بستر بچھا کر لیٹ گئے۔ پٹنے پہنچے تو سب ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرائے گئے۔ ایک کمرے میں، مَیں اور احتشام تھے۔ برابر کے کمرے میں پنڈت کیفی تھے۔ اس کے بعد کے کمرے میں مجاز اور جذبی تھے۔ رات کو سب سونے لیٹے ہی تھے کہ پنڈت جی کے کمرے سے شور شور اُٹھا "ارے دوڑیو۔ بچائیو۔ یہ مارے ڈالتا ہے"۔ ہم لوگ گھبرا کر دوڑے تو دیکھا کہ مجاز نشے میں پنڈت جی کے پَیر زور زور سے داب رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ آپ بزرگ ہیں، آپ کی خدمت میں سعادت ہے۔ پنڈت جی چیخ رہے تھے کہ ہائے مَیں مَرا، بڑی مشکل سے مجاز کو علیحدہ کیا۔ صبح ہوئی تو اب مجاز پنڈت جی کے سامنے نہیں آتے۔ آخر پنڈت جی نے بلایا۔ گلے سے لگایا اور کہا کہ مجاز تم سے اُردو شاعری کی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ تمھارے خلوص سے میں بڑا متاثر ہوا مگر خلوص میں تم نے میرا کام ہی تمام کر دیا ہوتا۔ بھائی اپنے آپ کو سنبھالو۔ تمھیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے"۔ ہم سب آبدیدہ ہوگئے۔

مجاز کے پاس زندگی اور ادب کا ایک خاصا واضح تصوّر تھا۔ اس نے نہ تو مطالعے سے اسے جِلا دی، نہ زندگی کی آگ میں کود کر اسے گلزار بنایا۔ وہ بڑے حسین خواب دیکھتا تھا۔ بعض بڑے حقائق کا بھی اُسے احساس تھا۔ مگر خوابوں کے اس رسیا کو جب حقائق نے چور چور کر دیا تو اس نے پلٹ کر کوئی وار نہیں کیا۔ خاموشی سے سپر ڈال دی۔ میں اسی وجہ سے اُسے رومانیت کا شہید کہتا ہوں۔

عام طور پر رومانیت کے معنی حدیث دلبری کے لئے جاتے ہیں۔ دراصل یہ تخیل پرستی ہے۔ یوں تو ادب زندگی کی تخیلی ترجمانی ہے مگر جب تخیل کی لے اتنی بڑھ جائے کہ حقائق یا عقل کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے تو رومانیت کے علم سب کچھ ہو جاتا ہے۔ اُردو شاعری میں رومانیت کی لے سب سے پہلے

ادب لطیف کے علمبرداروں میں ملتی ہے۔ اس کے بعد اختر شیرانی کے یہاں۔ اختر شیرانی اور مجاز میں خاصی مماثلت ہے۔ مگر اختر کے یہاں عنفوان شباب کے عشق کا سوز و ساز اور درد و کرب ہے۔ محبوب کی تصویر سینے سے لگا کر مرجانے کا ولولہ ہے۔ مجاز کی رومانیت میں انقلاب کے خواب بھی شامل ہیں۔ مجاز کے یہاں رومانیت کچھ تو جوش کی طرح باغیانہ ضربات کی گھن گرج میں ظاہر ہوتی ہے مگر اس میں بھی وہ اپنے آہنگ سے نہیں ہٹتے، دوسرے وہ بعض سماجی حقائق کا بھی گہرا احساس رکھتے ہیں اور اُنھیں شعر میں بیان کرسکتے ہیں۔ پھر مجاز کے لہجے میں اختر شیرانی کی سپردگی اور والہانہ پن کے ساتھ ساتھ نغمگی اور شیرینی کچھ زیادہ ہے۔ جوش کی شوکت و جزالت میں کرختگی کا احساس ہوتا ہے اور اُن کے یہاں باوجود غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کے، ناہمواری بھی ہے مجاز کے یہاں ہم آہنگی ہے۔ جوش خلوت میں بھی بہت اونچی آواز سے باتیں کرتے ہیں لیکن مجاز بھری محفل میں بھی دل نشین نرمی سے اپنی بات کہہ دیتا ہے۔

دراصل مجاز کی شاعری پر بے لاگ تبصرہ ابھی ممکن نہیں ہے۔ اِس لئے میں اس کی کوشش بھی نہیں کروں گا ہاں مجاز کی ادبی اہمیت کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اپنی نسل میں مجاز کے یہاں کلاسیکل شعرا کے انداز بیان کی باوقار سادگی ملتی ہے۔ دوسرے اس کے یہاں الفاظ کی صحت اور زبان کی نرمی و نزاکت کا احساس بھی ہم عصروں سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ مجاز نے ردولی کی فضا اور فانی کی صحبت سے ایک خاموش اثر لیا ہے۔ یہ اثر اس کے یہاں بڑی خوبی سے ظاہر ہوتا ہے۔ تیسری اہم بات یہ ہے کہ مجاز کے یہاں استعارے اور تشبیہات ایک خلاقانہ ذہن ظاہر کرتے ہیں۔ مجاز کی شروع کی نظمیں جیسے نمایش، نذر خالدہ، انقلاب اور رات اور ریل، اِسی خصوصیت کی وجہ سے قابل قدر بن جاتی ہیں۔ نمایش میں ایک رنگین فضا کی مصوری ادبی صناعی کا حسن رکھتی ہے۔ انقلاب میں ذہنی بچپن ہے مگر اس کے باوجود انداز بیان میں زور اور کیفیت ہے۔ 'رات اور ریل' حسن کاری کی اچھی مثال ہے۔ اس میں ارتقا اور سماج کے لفظ تو تعویذ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، مگر نظم میں بڑے شگفتہ اور رواں الفاظ میں ریل کی رفتار اور اُس کی نت نئی فضا کو قلم بند کرلیا گیا ہے۔ 'نذر خالدہ' بھی مجاز کی کامیاب نظموں میں سے ہے۔ اس میں خالدہ خانم کی پوری شخصیت کے سمندر کو مجاز نے ایک مصرع کے

کوزے میں بند کر لیا ہے۔

روح عشرت گاہِ ساحل، جانِ طوفانِ عظیم

اسی طرح 'رات اور ریل' میں یہ شعر دیکھئے :۔

تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرودِ دل نشیں
آندھیوں میں مینھ برسنے کی صدا آتی ہوئی
نو نہالوں کو سُناتی میٹھی میٹھی لوریاں
نازنینوں کو سُنہرے خواب دکھلاتی ہوئی
رعشہ بر اندام کرتی انجمِ شب تاب کو
آشیاں میں طائرِ وحشی کو چونکاتی ہوئی
ڈالتی بے حس چٹانوں پر حقارت کی نظر
کوہ پر ہنستی فلک کو آنکھ دکھلاتی ہوئی

مجاز کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے نوجوانوں کے عزمِ سرفروشی، ولولۂ حیات، قلندرانہ آن بان، جرائت رندانہ اور شوقِ بے باک کو حُسن کے غازے کے طور پر نہیں، چمنِ حیات کی حنابندی کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ ایک طرف وہ نوجوانوں میں ایک مجاہدانہ جوش پیدا کرنا چاہتا ہے، دوسری طرف خواتین کو بھی رزم گاہِ حیات میں شرکت کی دعوت دیتا ہے وہ نوجوان سے کہتا ہے ؎

جو ہو سکے ہمیں پامال کر کے آگے بڑھ
نہ ہو سکے تو ہمارا جواب پیدا کر
بہے زمیں پہ جو میرا لہو تو غم مت کر
اسی زمیں سے مہکتے گلاب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

نوجوان خاتون سے کہتا ہے ؎

سنانیں کھینچ لی ہیں سرپھرے باغی جوانوں نے
تو سامانِ جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

پردہ اور عصمت میں ارشاد ہوتا ہے

جو ظاہر نہ ہو وہ لطافت نہیں ہے
جو پنہاں رہے وہ صداقت نہیں ہے
یہ فطرت نہیں ہے مشیت نہیں ہے
کوئی اور شئے ہے یہ عصمت نہیں ہے
قسم شوخیٔ عشق سنجوگتا کی
قسم جون کے عزم صبر آزما کی
قسم طاہرہ کی، قسم خالدہ کی
کوئی اور شئے ہے یہ عصمت نہیں ہے

مجاز در اصل پرستار حسن ہے۔ یوں تو وہ لیلائے انقلاب کا بھی مجنوں ہے مگر حسُن کی ہر ادا کا

رمز شناس ہے۔ اس کی پرستش میں عاشق کا جذب و جنون ہے۔ حسن اُس کے لئے سب کچھ ہے۔ اُس نے حسن کو ہر عالم میں دیکھا۔ ڈھونڈھا اور چاہا اور پایا ہے۔ اِس بصیرت نے اس کے اشعار میں ایک سرمستی اور کیفیت بھر دی ہے۔ الفاظ میں جادو پیدا کر دیا ہے، اور اشعار کو پگھلا ہوا لاوا بنا دیا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

خاموشی محجوب میں اک سیلِ معانی ہر سانس میں احساسِ فراواں کی کہانی
جذبات کے طوفاں میں ہے دوشیزہ جوانی

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ

وہ اک مرمریں حورِ خلدِ برس کی وہ تعبیر آذر کے خوابِ حسیں کی
وہ تسکین دل تھی، سکونِ نظر تھی نگارِ شفق تھی، جمالِ سحر تھی

پیار کے قرب بصد شان احتیاط دلداریِٔ نسیم بہاراں لئے ہوئے
رخسار پر لطیف سی اک موجِ سرخوشی لب پر ہنسی کا نرم سا طوفاں لئے ہوئے

لبِ گلرنگ و حسیں، جسم گداز و سیمیں شوخیِٔ برق لئے لرزشِ سیماب لئے
نرم صوفے گود میں فردوس رعنائی لئے زلف کے خم مرمریں شانوں کی برنائی لئے
قہقہے جن میں صبا کا راگ سیاروں کے گیت نقرئی نے کی صدا جنت کے مہ پاروں کے گیت
بام و در پر اک تبسم تھا فضا گلرنگ تھی جنبشِ مژگاں دھڑکتے دل سے ہم آہنگ تھی

میرے نزدیک مجاز کی بہترین نظمیں آوارہ، 'خوابِ سحر' اور 'نذر علی گڑھ' ہیں۔ 'آوارہ' میں رومانیت کی پوری داستان درد آگئی ہے اور اس داستان میں ایک پوری نسل کے افسانۂ افسوں کا المیہ ہے مناظر کا حسن دل میں یوں چٹکیاں لیتا ہے ؎

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر دہکی ہوئی شمشیر سی اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں
پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اُٹھی، چوٹ سی دل پر پڑی اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

اِس آگ کا بھڑکنا دیکھئے ۔

دل میں اک شعلہ بھڑک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

'خوابِ سحر' میں حیرت انگیز سادگی کے ساتھ اپنی بات کہی ہے ؎

ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ جاتا تھا اُدھر دیکھا تو ہے

'نذرِ علی گڑھ' میں حیرت انگیز حسن اور سحر کاری کے ساتھ ایک تعلیمی ادارے کی تہذیبی عظمت کا ترانہ گایا ہے ۔

جو طاقِ حرم میں روشن ہے وہ شمع یہاں بھی جلتی ہے
اس دشت کے گوشے گوشے سے اک جوئے حیات اُبلتی ہے
ہر شام ہے شامِ مصر یہاں ہر شب ہے شبِ شیراز یہاں
ہے سارے جہاں کا سوز یہاں اور سارے جہاں کا ساز یہاں
آ آ کے ہزاروں بار یہاں خود آگ بھی ہم نے لگائی ہے
پھر سارے جہاں نے دیکھا ہے یہ آگ ہمیں نے بجھائی ہے
جو ابر یہاں سے اُٹھے گا وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا، ہر کوہِ گراں پر برسے گا
ہر سرو و سمن پر برسے گا، ہر دشت و دمن پر برسے گا
یہ ابر ہمیشہ برسا ہے، یہ ابر ہمیشہ برسے گا

مجاز کی نظموں کے مقابلے میں اُس کی غزلوں کی اہمیت کم ہے، مگر ان میں بھی ہمیں شوق کی بے باکی، جنون کی بلند حوصلگی، جذبے کی مصوری، درد کی داستان، غرض بہت کچھ ملتا ہے ۔ یہ شعر ملاحظہ کیجئے ؎

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے، کچھ کہہ نہ سکے، کچھ سُن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تری سونی نہ ہوئی، کچھ اُٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

اے شوقِ نظارہ کیا کہئے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصور کیا کیجے ہم صورتِ جاناں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا، اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے، اپنا ہی گریباں بھول گئے

دل دھڑک اُٹھتا ہے خود اپنی ہی ہر آہٹ پہ | اب قدم منزلِ جاناں سے بہت دُور نہیں

کیا کیا ہوا ہے ہم سے جنوں میں نہ پوچھئے | اُلجھے کبھی زمیں سے کبھی آسماں سے ہم

بارہا ایسا ہوا ہے یاد تک دل میں نہ تھی | بارہا مستی میں لب پہ اُن کا نام آ ہی گیا

شوق کے ہاتھوں اے دلِ مضطر کیا ہونا ہے کیا ہوگا | عشق تو رسوا ہو ہی چکا ہے حُسن بھی کیا رسوا ہوگا

واعظ سادہ لوح سے کہہ دو چھوڑے عقبیٰ کی باتیں | اِس دنیا میں کیا رکھا ہے اُس دنیا میں کیا ہوگا

جنونِ شوق اب بھی کم نہیں ہے | مگر وہ آج بھی برہم نہیں ہے

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا | تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

ابھی بزمِ طرب سے کیا اٹھوں میں | ابھی تو آنکھ بھی پُر نم نہیں ہے

بایں سیلِ غم و سیلِ حوادث | مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

یہ بجلی چمکتی ہے کیوں دمبدم | چمن میں کوئی آشیانہ بھی ہے

زمانے سے آگے تو بڑھئے مجازؔ | زمانے کو آگے بڑھانا بھی ہے

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا، مجازؔ کی شاعری پر بے لاگ تبصرہ تو ابھی ممکن نہیں ہے، مگر اُس کی شخصیت اور شاعری کے متعلق جو نقش دلوں میں بیٹھ گئے ہیں اُن کی کچھ عکاسی تو کی جا سکتی ہے۔ مجازؔ کی زندگی اور شاعری میں، رومانیت کی رَو کی ہر لہر ملتی ہے۔ 'طفلی کے خواب' سے 'اعتراف' تک ایک خاصی مربوط داستان ہے۔ مجازؔ کی رومانیت میں جو جاندار، صحت مند اور باشعور حصہ ہے اُس کی قدر و قیمت مستقل ہے، لیکن اس کی پوری شاعری بھی ہمارے لئے بصیرت و عبرت کا سامان رکھتی ہے۔ وہ ایک شہاب ثاقب کی طرح ہمارے ادبی اُفق پر رونما ہوا تھا۔ اُس کی روشنی بڑی نظر نواز تھی۔ دیکھتے دیکھتے ہستی داد، طبیعت کی کمزوری اور خوابوں کی موجودہ پست اور کاروباری دنیا میں کوئی قیمت نہ ہونے کی وجہ سے اس شعلے کو زمانے کی نظر کھا گئی۔ مگر اس نے ہمیں درد و داغ، آرزو اور جستجو کا جو خزانہ دیا ہے اس سے ہم کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

مجازؔ —— فکر و فن کے چند پہلو

سیدّ احتشام حسین

شاعری کس حد تک وقت کے تقاضوں سے بے نیاز، ماحول سے بیگانہ، گرد و پیش سے بےتعلق، کسی مخصوص نقطۂ نظر سے ماوراء، اور ازلی اور مثالی تصورات کی حامل ہوسکتی ہے، اس کے متعلق ہمیشہ سے بحث ہوتی آئی ہے۔ یہ خیالات صحیح ہوں یا غلط، کوئی درمیانی راستہ رکھتے ہوں، نفس شاعری کے متعلق ان کی حیثیت بنیادی سوالات کی ہو یا بالکل ناقابلِ اعتناء ہوں، اس وقت اپنے فلسفیانہ اور نظریاتی مفہوم میں میرے پیش نظر نہیں ہیں۔ جس نے بھی مجازؔ کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے وہ یہ بات بغیر کسی بحث کے تسلیم کرتا ہے کہ اُن کے فن میں روحِ عصر جلوہ گر ہے، اُن کے تجربوں میں بیسویں صدی کے حساس نوجوان کے تجزیوں کی جھلک ہے، اُن کے موضوعات میں تصوریت اور مثالیت کے مقابلہ میں عمومیت، ارضیت اور اصلیت کی فراوانی ہے اور ان باتوں کو نظرانداز کرکے اُن کے فن یا خیالات کا مطالعہ بےسود اور غیر حقیقی ہوگا۔

یہ تو ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ شاعری کی دنیا میں انفرادی تجربوں کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوتی ہے لیکن کیا یہ تجربے اپنی نوعیت اور حقیقت کے لحاظ سے اُسی عہد کے تمام دوسرے انسانوں کے تجربوں سے مختلف ہوسکتے ہیں؟ کیا ان انفرادی تجربوں کو کسی عمومی نظامِ فلسفہ میں منضبط نہیں کیا جاسکتا؟ کیا محض کیف و کم کا اختلاف ہر شاعر سے ایک بالکل نجی اور ذاتی فلسفہ یا اپنی دنیا کی تخلیق کراسکتا ہے؟ ان اہم سوالات نے ادب و شعر کے فلسفیوں، نفسیات کے عالموں اور نقادوں کو مختلف گروہوں میں بانٹ رکھا ہے۔ دیکھنا چاہیئے کہ انفرادی تجربہ اور عمومی فلسفہ میں کتنا تضاد ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے۔

اس سے صرف مجاز کی نہیں ہر ایسے شاعر کے سمجھنے میں آسانی ہوگی جس نے اپنی شاعری کو معمّہ اور چیستان بنانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ مجاز نے ایک جگہ فخریہ انداز میں اپنے لئے "شاعر بیدار" کا لفظ استعمال کیا ہے، بیداری محض داخلی کیفیت نہیں ہے اپنے اندر ایک خارجی وصف رکھتی ہے، بیداری فرد اور اُس کے ماحول کے درمیان رشتہ اور رابطہ کا نام ہے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے یہ رشتہ زیادہ تر جذباتی ہوگا (کیونکہ شاعر حقائق کو جذبات کا لباس پہنا کر پیش کرتا ہے) لیکن ان جذبات کی جڑیں احساس محض اور خیالِ محض میں نہیں ہوسکتیں، یہ جذبات انفرادی ہوتے ہوئے بھی عمومی، آفاقی اور سماجی ہوتے ہیں۔ انفرادی تجربوں کا اظہار، شاعرانہ اظہار، اِس اظہار کے ذریعہ اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے یا اپنے آپ کو پالینے کی خواہش کچھ ایسی بیجا بات نہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اپنے آپ کو بھرپور انداز میں دیکھنا اور سمجھنا بھی بعض سماجی رابطوں اور معیاروں کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ فرد جن سماجی رشتوں میں جکڑا ہوا ہے وہ حقیقی ہیں، اس کا سماج سے تعلق کیا ہے اِس کے مختلف مدارج اور مختلف نوعیتیں ہوسکتی ہیں۔ اس سے آزادی ممکن نہیں ہے۔ یہ "یار" سے غالب کی چھیڑ چلی جانے والی بات ہے، لطف نہیں ہے تو عداوت ہی سہی۔

چونکہ یہ مسئلہ اہم ہے اور بعض لوگوں کی چڑ بن گیا ہے اِس لئے اسے ایک اور طرح سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ کسی کو چڑھانا مقصود نہیں ہے، شاعری میں فکر و فن کے امتزاج کو سمجھنے کی کوشش ہے۔ مشکل ہی سے کوئی شاعر ہوگا جسے سماج کے ہر طبقے، ہر ادارے، ہر عزم اور عمل سے مکمّل اتفاق یا سرتاسر اختلاف ہو۔ جزوی اتفاق یا اختلاف کے اخلاقی، سیاسی، ذہنی یا جذباتی وجوہ ہوسکتے ہیں اور جب تک ہم اسے تسلیم نہیں کرلیتے کہ شاعر کے پاس کوئی اخلاقی، سیاسی یا ذہنی نظریہ ہو ہی نہیں سکتا اُس وقت تک ہم اُس کے مطالعہ میں ان پہلوؤں پر بھی نگاہ رکھنے پر مجبور ہوں گے۔ کہا جاتا ہے کہ شاعر کے پاس مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور فلسفیانہ عقائد ہوتے تو ہیں لیکن شاعری میں اِن کی جستجو فضول ہے۔ ہمارے قدیم شعراء اپنے ان عقائد سے بلند ہوکر شاعری کرتے تھے۔ یہ بات کسی طرح سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔ طرزِ اظہار، حسنِ بیان اور انتخابِ الفاظ کے پردے میں وہ اُن جذبات کا اظہار کرتا ہے جو اُس کے عملی یا ذہنی تجربے

وجود میں آتے ہیں۔ ان کی صداقت کی کسوٹی کسی دوسرے شخص کے لئے کیا ہو سکتی ہے، اِس کا جواب بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ ماضی کے متعلق اس طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ قدیم شعرا بھی اخلاقی، جذباتی یا روحانی کشمکش میں مبتلا ہوتے تھے اور اپنے ڈھنگ سے اس کا اظہار کرتے تھے۔ کم سے کم دنیا کے اہم ترین شعراء کے لئے یہی درست ہے۔ اُن کے خیالات، موضوعات اور جذبات کی کوئی نہ کوئی سمت ہے، اس لئے اگر چند شاعر، ادیب یا نقاد یہ کہتے ہیں کہ شاعر کی انفرادیت سماج اور زندگی کے ہر عمل سے آزاد ہے تو انھیں اِس بات کو ثابت کرنا ہوگا۔ اس طرح یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ شاعر کے انفرادی تجربہ اور عمومی فلسفہ میں تضاد امر لازم نہیں ہے، اگر اتفاق یا اختلاف ہوگا تو اُس کے بھی سمجھ میں آنے والے اسباب ہوں گے۔

اِن خیالات کی روشنی میں مجازؔ کی شاعری ایک مخصوص مفہوم اختیار کرلے گی، انفرادی تجربے عام زندگی سے ہم آہنگ ہوکر وسعت اختیار کرلیں گے، ذاتی خیالات اور تاثرات آفاقی حقیقتوں کا جزو بن جائیں گے اور اِس نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی ہوگی کہ ان کی شاعری محض چند عقائد کو شاعرانہ لباس اور زیور سے آراستہ کردینے کا نام نہیں ہے بلکہ "خونِ دِل" ہے جو "چمن بندیِ دوراں" کی نذر کیا جارہا ہے۔

مجازؔ نے جب باقاعدہ شاعری شروع کی اُس وقت ہندوستان کی زندگی تیز رفتاری سے بدل رہی تھی، یہ کچھ اثرات قبول کرنے اور کچھ روایات کے چھوڑنے، اپنے عزم و عمل کی تنقید کرنے، حوصلوں کی نئی آگ میں جلنے اور انفرادی اور اجتماعی آسودگی کی پیچیدہ اور بے کنار جد و جہد میں شریک ہونے کا زمانہ تھا۔ مشرق اور مغرب، نئے اور پُرانے کی کشمکش کسی حد تک ختم ہو چکی تھی یا کم سے کم اس کشمکش کی نوعیت اپنے طبقاتی تعلق یا ذوق اور مطالعہ کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے لئے واضح ہوگئی تھی، سیاست میں قومی بیداری اور معاشی کشاکش کی منزلیں نمایاں تھیں اور اُردو شعر و ادب کی دنیا ان حقائق سے بیگانہ نہ تھی۔ اٹھارویں صدی کے وسط سے شعراء نے وقت کی آواز پر کان دینا شروع کردیا تھا اور بغیر جھجک کے ادب اور شاعری کو مقصد کے تابع ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ ادب سے زندگی کے اِس نئے تعلق کا اثر اسلوب اور طرزِ اظہار پر بھی پڑا اور اس کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے چنانچہ جب ہم اُس ادبی روایت کی تاریخ دیکھنا چاہیں گے، جس سے مجازؔ کی شاعری کا تعلق تھا تو ہمیں ایک طرف حالیؔ، آزادؔ، شبلیؔ،

اقبال، چکبست، سرور جہان آبادی، حفیظ، جوش، اختر شیرانی کو سمجھنا ہوگا دوسری طرف اس نئی غزل گوئی کو جس کی نمایندگی حالی، شاد عظیم آبادی، حسرت، فانی، صفی، عزیز، ثاقب، اصغر اور جگر کر رہے تھے۔ ان تمام شعراء کا شعور کسی نہ کسی حیثیت سے اپنے عہد کے خیالات اور جذبات سے متاثر تھا، روایت کا تسلسل ٹوٹا نہیں تھا لیکن ان شعراء کے یہاں چند روایات کی صدائے بازگشت بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ مجاز کو زندگی اور شاعری کا یہی ورثہ ملا جس میں اُن کے انفرادی تجربوں، وقت کے تقاضوں، ذہنی صلاحیتوں اور فنی بصیرتوں نے اضافہ کیا۔

مجاز کی ابتدائی شاعری، جسے مشق سخن کی منزلِ اوّلین کہہ سکتے ہیں، ہمارے سامنے نہیں ہے۔ معلوم نہیں انھیں لکھنؤ کے ماحول سے فن کے ایک مبہم سے تصور سے سوا اور کیا ملا۔ لکھنؤ میں وہ عمر کی اُس منزل میں بھی نہیں پہنچے تھے جہاں گہری سوجھ بوجھ کی توقع کی جا سکے لیکن جب وہ آگرہ پہنچے تو وہاں انھیں ایک بہتر ادبی ماحول ملا جہاں اتفاق سے عصرِ جدید کے چند اچھے شعراء یکجا ہو گئے تھے۔ اُس وقت اگر فانی کا جادو اُن پر چل گیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن شعوری ارتقاء کے لحاظ سے وہ فانی سے بہت مختلف تھے اِس لئے فانی سے اُن کا تعلق ذہنی نہیں فنی رہا اور وہ بھی تھوڑے ہی دنوں کے لئے۔ علی گڑھ ہمیشہ کسی نہ کسی حیثیت سے ایک ہیجان انگیز ماحول کا حامل رہا ہے اور ۱۹۳۰ء سے بعد کی سیاسی تگ و دَو نے تو اُسے خاص طور سے متاثر کیا تھا چنانچہ مجاز کے شعور کو وہاں پہنچ کر نئی غذا ملی اور احساس کی منزلیں جلد جلد طے ہونے لگیں۔ عمر کی وہ منزل تھی جس کے لئے شاد عظیم آبادی نے "اُف ری جوانی ہائے زمانے" کے بولتے ہوئے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ یہاں جذبات اور تجربات کا تجزیہ آسان نہیں رہ جاتا۔ تحلیل نفسی سے دلچسپی لینے والے تو آسانی کے ساتھ جنسی جذبے کے اُبھار، آسودگی اور ناآسودگی، ارتقائے فن، سماجی شعور کی بیداری، فلسفۂ زندگی کے انتخاب، کچھ کر گذرنے اور محض خواب دیکھنے کو ایک ہی میں منسلک کر دے گا اور ہر طرح کے تجربے اور اُس کے ردِّ عمل کو جنسی یا کسی ایسے ہی جذبے کے غیر معتدل اظہار یا ارتفاع کی شکل میں دیکھیں گے لیکن یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہے۔ یقیناً جوانی کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور وہ تسکین چاہتے ہیں لیکن یہ حیاتیاتی بیداری جب زندگی کے دوسرے جذبات سے آمیز ہو جاتی ہے تو

محض رومانی والہانہ پن بن کر نہیں رہ جاتی بلکہ شاعر کی دنیا کو وسیع کرتی ہے اور وہ یہ اعلان کرتا ہے سہ

عشق ہی عشق ہے دنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں

خواب عشرت میں ہیں ارباب خرد
اور اک شاعر بیدار ہوں میں

زندگی کیا ہے گناہِ آدم
زندگی ہے تو گنہگار ہوں میں

لے کے نکلا ہوں گہرہائے سخن
ماہ و انجم کا خریدار ہوں میں

دیر و کعبہ میں ہیں میرے چرچے
اور رسوا سرِ بازار ہوں میں

کفر و الحاد سے نفرت ہے مجھے
اور مذہب سے بھی بیزار ہوں میں

حور و غلماں کا یہاں ذکر نہیں
نوعِ انساں کا پرستار ہوں میں

اہلِ دنیا کے لئے ننگ سہی
رونقِ انجمن یار ہوں میں

مجھ سے برہم ہے مزاجِ پیری
مجرمِ شوخیٔ گفتار ہوں میں

محفلِ دہر پہ طاری ہے جمود
اور وارفتہ رفتار ہوں میں

اک لپکتا ہوا شعلہ ہوں میں
ایک جلتی ہوئی تلوار ہوں میں

میں نے اس نظم کے بعض شعر چھوڑ دئے ہیں اور معنوی تسلسل کے لئے اشعار کی ترتیب بدل دی ہے
اس نظم کا لکھنے والا جنسی شعور کی راہوں سے ہو کر سماجی شعور کی وسیع تر دنیا میں قدم رکھ رہا ہے شخصیت مختلف خانوں میں بٹ نہیں رہی ہے بلکہ مختلف قسم کے تجربے سمیٹ رہی ہے، محدود جذباتی دنیا کا خول توڑ کر باہر نکل رہی ہے۔ شعور کی تشکیل میں وقتاً فوقتاً جو عناصر شامل ہوتے ہیں وہ پچھلے عناصر کی مکمل نفی نہیں کرتے، اس لئے اس تبدیلی کی حالت میں جذبات کی ترکیب پیچیدہ ہو جاتی ہے اور ایک ہی نظم کے اندر کئی عناصر یکجا ہو جاتے ہیں جس نظم کے اشعار اوپر دئے گئے ہیں اُن میں بھی یہی بات دیکھی جا سکتی ہے لیکن یہاں "اَنا" کی حدیں وسیع ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

کسی شاعر کے ذہنی، جذباتی اور فنی ارتقاء کے لئے اُس کی چند اہم نظموں کا انتخاب کر کے یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ اُس کے تجربے کس طرح زندگی کا جزو بن کر فن کے سانچے میں ڈھلتے جاتے ہیں۔

احساسِ فن کا ارتقا محض اندازِ بیان کی پختگی نہیں ہے اور نہ ہیئت کے نت نئے تجربے بلکہ فن کار کی اُس صلاحیت کا ارتقا ہے جو موضوع، مواد اور ہیئت کو ایک کرتی ہے۔ اگر چند نظموں میں بھی فکری اور فنّی ارتقا کا تسلّی بخش احساس ہو جائے تو یہ شاعر کی کامیابی کی دلیل ہے۔ غزلوں کو چھوڑ کر میں مجاز کی حسبِ ذیل نظموں کا انتخاب اس سلسلہ میں کروں گا:۔ آج کی رات، رات اور ریل، انقلاب، تعارف، نذرِ علیگڑھ، اندھیری رات کا مسافر، آوارہ، سرمایہ داری، خوابِ سحر، عشرتِ تنہائی، عیادت، اعتراف، مہمان اور فکر۔ یہ نظمیں مجاز کے ارتقائے ذہن اور فن کی راہ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے کسی نظم کو پیشِ نظر رکھ کر کسی نہ کسی حد تک ان کی انفرادیت، سماجی شعور اور احساسِ فن کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

صرف مجاز ہی کے لئے نہیں عہدِ حاضر کے اکثر نوجوان شعراء کے لئے یہ بات کہی گئی ہے کہ وہ رومان سے انقلاب کی طرف آئے، اِس سے کبھی تنقیص مراد ہوتی ہے اور کبھی توصیف۔ یہ کچھ بھی نہ ہو تو کم سے کم شاعر کے سمجھنے میں اس سے مدد لی جا سکتی ہے۔ مجاز کی ابتدائی شاعری کی رومانیت آہستہ آہستہ انقلابی رومانیت میں تبدیل ہوتی رہی، وہ اکثر و بیشتر صحت مند اور زندگی بخش رہی، اُس نے مجاز کو گرفتار نہیں رکھا بلکہ اُن کے جوش اور ولولہ کو مہمیز کرتی رہی، انھیں زندگی سے محبت کرنا سکھاتی رہی۔ میں اس سے پہلے ایک مضمون "مجاز کی شاعری میں رومانی عناصر" لکھ کر اس رومانیت کی نوعیت سے بحث کر چکا ہوں، اس وقت اتنا ہی کہنا ہے کہ اس نے شعور کی مختلف منزلوں میں مجاز کے شاعرانہ حس اور سماجی بصیرت کا ساتھ دیا۔ سچ پوچھئے تو ارتقاءِ شعور کی یہ رفتار عام ہے اور چونکہ شاعرانہ حُسن اور فن کارانہ رنگینی کے ساتھ پیش ہوئی ہے اس لئے نوجوان نسل کی امنگوں اور خواہشوں، کامیابیوں اور ناکامیوں، ہزیمتوں اور فتحمندیوں کی آئینہ دار بن گئی ہے۔ اِس نے مجاز کو نوجوانوں کا محبوب شاعر بنا دیا۔ ان کے تجربے ان کے ہوتے ہوئے بھی لاکھوں نوجوانوں کے تجربے تھے۔ یہ تجربے مذہبی، روحانی یا مابعد الطبیعیاتی تجربے نہیں ہیں جن میں دوسرا آسانی سے شریک نہ ہو سکے بلکہ اُس زندگی کے عام تجربے ہیں جو محبت، آرام، سکون، آزادی اور روزگار کی بھوکی ہے۔ اِس جگہ میں اُس صورتِ حال کا جائزہ نہیں لینا چاہتا جو ۱۹۳۰ء کے بعد سے ہندوستان کی قسمت کی تشکیل کر رہی تھی، معمولی غور و فکر سے ہر شخص اس کا اندازہ کر سکتا ہے۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ

تخریب کے جذبے اور تعمیر کی خواہش میں ظاہر ہو تو ہمیں اس کو ایک قدرتی بات سمجھنا چاہیئے۔ ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر انقلاب ، اندھیری رات کا مسافر ، سرمایہ داری ، آوارہ اور خواب سحر کا مطالعہ کیجیئے تو انفرادی تجربہ اور عمومی فلسفہ، زندگی کے تعلق اور فن میں اُس تعلق کے اظہار کی معنویت کا اندازہ ہو سکے گا۔ مواد اور ہیئت کے تعلق کے یہی معنی ہیں اور یہی شاعری ہے۔

کامیاب اور پُراثر شاعری کے پرکھنے کے ذرائع کیا ہیں یہ فنِ نقد کا بے حد مشکل مسئلہ ہے۔ اس وقت اِس کو چھیڑنا بھی نہیں ہے مگر اتنا کہنا ضروری ہے کہ اس کے بعض مثبت اور بعض منفی عناصر پیش نگاہ ہوں تو پرکھ کا کوئی معیار ضرور قائم ہو سکتا ہے۔ منفی عناصر میں ابہام ، پراسرار انفرادی تجربے ، غیر واضح مضامین ، بے جا اشاریت ، دور از کار تشبیہ اور استعارے ہو سکتے ہیں تو مثبت میں مواد کی معنویت اور اظہار کا حسن ، شخصیت اور فن میں ہم آہنگی وغیرہ کو شمار کر سکتے ہیں۔ مجاز کی شاعری کے پرکھنے میں ان عناصر سے بڑی مدد ملتی ہے۔ انھوں نے قدیم اور مروّج شاعرانہ روایات اور اسالیب بیان کا احترام کرتے ہوئے اپنے سوزِ نفس سے ان میں تازگی ، جدت اور کیفیت پیدا کی۔ مجاز کے لہجے کا دھیماپن ، رَس ، کیف ، گھلاوٹ اور رعنائیت ، موضوعات کی عمومیت اور عصریت سے مل کر لطیف شاعرانہ پیکر اختیار کرتے ہیں۔

تفصیل کی گنجائش نہیں ورنہ اُن کی بعض نظموں کا تجزیہ ان نتائج کی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا تاہم خاتمہ پر ایک نظم کے متعلق کچھ کہنا بے سود نہ ہوگا۔ مجاز ذہنی کرب کی منزلوں سے کئی بار گذرے لیکن جیسے ہی اُن کا مزاج اعتدال پر آیا ، اُن کے تصورات کی ساری رعنائیاں ایک ایک کرکے واپس آئیں۔ یہ خیال مجھے اُس وقت سب سے زیادہ آتا ہے جب میں اُن کی نظم فکر پڑھتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ مجاز کی آخری اہم نظم ہے جسے اُن کی شخصیت اور شاعری ، فکر اور فن کا نقطۂ عروج کہہ سکتے ہیں۔ اس نظم میں شاعر کے ماضی ، حال اور مستقبل کے خیال و خواب ، امید اور یاس ، پسپائی اور عزم ، ناآسودگی اور جذبۂ عمل سبھی کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ اُن کی دوسری اہم نظمیں ذہنی فضا میں پرواز کی مختلف منزلیں تھیں ، فکر اُن کے وجود کی ہمہ گیری اور شخصیت کے اندر شدید انفرادی اور سماجی

کشمکش کی مظہر ہے۔ سات بندوں (چار چار مصرعے کے بند) کی یہ مختصر سی نظم اِس بند سے شروع ہوتی ہے

(۱) نہیں ہر چند کسی گم شدہ جنت کی تلاش
اِک نہ اِک خلد طربناک کا ارماں ہے ضرور

بزم دوشینہ کی حسرت تو نہیں ہے مجھ کو
میری نظروں میں کوئی اور شبستاں ہے ضرور

اِس میں گم شدہ جنت کی تلاش سے بے تعلقی ظاہر کر کے خیالی اور فرضی مستقبل کے بجائے ایک حقیقی جنتِ ارضی کی خواہش کا شاعرانہ اظہار، مجاز کو عام انسانوں سے قریب رکھتا ہے۔ اِس مستقبل کیلئے شعوری یا غیر شعوری طور پر کس کی روح بے قرار نہیں ہے! "ہر چند" اور "ضرور" کا شاعرانہ استعمال اختصار کے ساتھ اہم مفہوم ادا کرتا ہے۔ جو خوبصورت راتیں دوسروں نے سجائیں اُن کا کیا غم لیکن آنے والی راتوں کی سجی ہوئی محفلیں ضرور اپنی طرف بُلا رہی ہیں، ان میں شرکت کی خواہش ہے۔ نظم شروع ہوتے ہی شاعر کے مزاج، شوق اور حوصلہ کا پتہ دے دیتی ہے۔ معنوی حیثیت سے الفاظ کا انتخاب اتنا ہی فکر انگیز ہے جتنا موسیقی اور ترنم کے لحاظ سے دلکش۔ نظم کے باقی بند بھی لکھ دوں تو کچھ کہنے میں آسانی ہوگی اور اس کا مجموعی اثر بھی منتشر نہ ہوگا ؎

(۲) مِٹ کے، برباد جہاں ہو کے، سبھی کچھ کھو کے
بات کیا ہے کہ زیاں کا کوئی احساس نہیں

کارفرما ہے کوئی تازہ جنونِ تعمیر
دلِ مضطر ابھی آماجگہ یاس نہیں

(۳) تازہ دم بھی ہوں، مگر پھر یہ تقاضا کیوں ہے
ہاتھ رکھ دے مرے ماتھے پہ کوئی زہرہ جبیں

ایک آغوشِ حسیں شوق کی معراج ہے کیا!
کیا یہی ہے اثرِ نالۂ دلہائے حزیں

(۴) مدہوشوں کا طرب انگیز تبسم کیا ہے
ہے تو سب کچھ یہ مگر خواب اثر کیوں ہو جائے

حُسن کی جلوہ گہِ ناز کا افسوں تسلیم
یہی قربانگہ اربابِ نظر کیوں ہو جائے

(۵) میں نے سوچا تھا کہ دشوار ہے منزل میری
اک حسیں بازوئے سیمیں کا سہارا بھی تو ہو

دشتِ ظلمات سے آخر کو گذرنا ہے مجھے
کوئی رخشندہ و تابندہ ستارا بھی تو ہو

(۶) آگ کو کس نے گلستاں نہ بنانا چاہا
جل بجھے کتنے خلیل آگ گلستاں نہ بنی

ٹوٹ جانا درِ زنداں کا تو دشوار نہ تھا
خود زلیخا ہی رفیقِ مہِ کنعاں نہ بنی

(۷) بایں انعامِ وفا، اُف یہ تقاضائے حیات
زندگی وقفِ غمِ خاک نشیناں کردے

خونِ دل کی کوئی قیمت جو نہیں ہے تو نہ ہو
خونِ دل نذرِ چمن بندیِ دوراں کردے

مستقبل کی "خلد طربناک" کا ذکر کرنے اور اُس سے لَو لگانے کے بعد شاعر کو ماضی کا خیال آیا جس میں بہت سے ارمانوں کا خون ہوا تھا۔ وہ اس کی تفصیلات پیش نہیں کرتا محض تین چھوٹے چھوٹے فقروں سے ناکامی اور بربادی کے احساس کی شدت ظاہر کرتا ہے لیکن یہ بھی بتا دینا چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوا ہو، اب وہ تازہ دم ہو کر پھر خوشیوں اور آسودگیوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہونا چاہتا ہے۔ یہ مایوسیاں جنسی، جذباتی اور مادی تھیں، انھوں نے مٹایا اور برباد کیا لیکن جستجو کا حوصلہ نہیں چھینا۔

مجازؔ کے یہاں یہی رجائیت اور اُمید ایک ایسا عنصر ہے جو "تازہ جنونِ تعمیر" کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ تیسرے بند میں اُس کی جوانی اُسے پھر کسی زہرہ جبین کی یاد دلاتی ہے، ایسی زہرہ جبین جو اُس کے جنونِ تعمیر میں اُس کی ساتھی بن جائے۔ یہ خیال ایک کشمکش کی شکل اختیار کرتا ہے اور بعد کے تین بند شاعر کے دل میں ایک جنگ کی صورت اختیار کرتے ہیں وہ سوچتا ہے کیا زندگی کا مقصد آغوشِ حسین کے سوا اور کچھ نہیں ہے؟ وہ بیراگی یا رہبانیت پسند نہیں ہے، اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ محبت کی نگاہ میں بڑی قوت ہے، ایک حسین بازوئے سیمیں کا سہارا جدوجہد کی منزل میں بڑی مدد کر سکتا ہے لیکن ایک ایسے باشعور نوجوان کی طرح جس کے سامنے انسانیت اور قوم کی تقدیر کا فیصلہ ہونے والا ہو مجازؔ بھی اسی کو سب کچھ سمجھنے پر تیار نہیں۔ یہ درست ہے کہ اگر سماجی رکاوٹوں کو توڑ کر حُسن اور عشق ہم نوا اور ہم آغوش ہو جائیں تو زندگی کا نقشہ بدل سکتا ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے تو جوشِ حیات اور جنونِ تعمیر کو ختم نہیں ہو جانا چاہئے۔ مجازؔ نے اِن خیالات کو جن شاعرانہ رنگ آمیزیوں کے ساتھ پیش کیا ہے اُنھوں نے حقائق کو زیادہ سنگین اور پُر اثر بنا دیا ہے۔

اب آخری بند دیکھئے۔ محبت میں شکست اور پسپائی، ناکامی اور نامرادی نے مجازؔ کو تباہ کیا لیکن اُس نے ایک ہلکے سے طنز کے علاوہ اور کچھ نہ کہا۔ اُس نے کوئی واسوخت نہیں لکھا کیونکہ وہ محبت کی سماجی پیچیدگیوں اور محبوب کی مجبوریوں سے واقف تھا۔ تقاضائے حیات میں جنسی محبت محض ایک جزو ہے، بحرِ حیات کی صرف ایک موج، زندگی محبت سے بڑی ہے اور مایوسی کے بعد بھی کفن باندھ کر اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے نکل پڑنے کی دعوت دیتی ہے۔ تقاضائے حیات کا مطالبہ ہے کہ رگوں میں جو خون بچ رہا ہے وہ بھی کام آئے، مجازؔ نے اپنی روح کی پوری قوت سے لبّیک کہا ؎

خونِ دل کی کوئی قیمت جو نہیں ہے تو نہ ہو
خونِ دل نذرِ چمن بندیٔ دوراں کر دے

ایسے شاعر سے کون محبت نہ کرے گا جو خون کے بچے کھچے قطروں سے چمن بندیٔ دوراں کا کام لینا چاہتا ہے! اس نظم میں مجازؔ کے فن اور فکر کا خوبصورت امتزاج ہے اور یہی اُن کی شاعری کا بنیادی آہنگ ہے۔ نہ اُن کے خیالات اور تصورات سے شاعرانہ لطافتیں مجروح ہوتی ہیں اور نہ شاعرانہ مینا کاری اور مرصع سازی اُن کے خیالات اور جذبات کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ نوجوان شعرا میں جس نے سب سے زیادہ اس راز کو سمجھا وہ مجازؔ ہیں۔

اُردو شاعری گذشتہ پچیس سال میں (اور یہی پچیس سال مجازؔ کی شاعری کی عمر بھی ہے) مختلف قسم کے تجربات سے گذری ہے۔ یہ تجربے صرف ہیئت ہی میں نہیں ہوتے ہیں بلکہ موضوعات کے انتخاب میں بھی ہوتے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں آزاد نظم گوئی کا رواج اور شعور اور لاشعور کی پیچیدگیوں کے ساتھ جنسی یا نفسیاتی الجھنوں کا مُبہم بیان، دو مخصوص چیزیں ہیں جن پر ضرور نگاہ جاتی ہے۔ بعض شعراء نے انھیں جدّت سمجھ کر اختیار کیا، بعض نے نقل کی، بعض نے اسے اپنی شاعرانہ شخصیت کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا۔ کچھ اس میں بے راہ روی اختیار کر گئے اور کچھ ایک چھوٹی سی دنیا میں محدود ہو کر رہ گئے۔ ان تجربہ کرنے والوں میں سے اکثر اُن قدروں کی کھلی یا چھپی مخالفت کرنے میں لطف محسوس کرتے رہے جنھیں ترقی پسندانہ کہا جاتا تھا، گویا ساری شاعری نے ایک منفی نوعیت اختیار کر لی لیکن مجازؔ نے کبھی محض اس تجربہ کی کشش محسوس نہیں کی اور شاعری کو اُن اعلیٰ مقاصد کے لئے وقف رکھا جو تعمیر حیات کے کام آتے ہیں۔ مجازؔ نے اس کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ شاعری میں تازگی، گرمی اور اثر محض ان تجربوں سے نہیں خلوص، مقصد کی عظمت، الفاظ کے فنکارانہ صرف اور فنّی روایات کے تخلیقی استعمال سے پیدا ہوتی ہے اس لئے مجازؔ کی شاعری چاہے عظیم نہ ہو پُر اثر، پُر سحر اور پُرکار ضرور ہے۔ یہی چیز انھیں اردو کا مقبول اور جوانوں کا محبوب شاعر بناتی ہے۔

منیب الرحمٰن

شاعر کی موت

وہ ایک پھول تھا سورج کو جو ترستا ہو
اسے ملی تھی شبانِ الم کی بیتابی
غموں کی زندہ دلی ، انجمن کی تنہائی
وہ چاہتا تھا کہ جوئے سحر میں غسل کرے
سکھائے اپنے پر و بال نرم کرنوں میں
تجلیوں سے سنے نغمہ ہائے بیداری
سمیٹ لے شفقِ رنگ و نور آنکھوں میں
اسے مسل ہی دیا زندگی کے ہاتھوں نے

فضا میں کھول دیے گیسوئے فغاں ہم نے
اٹھائیں حسن پریشاں کی پتیاں ہم نے
صبا کی راہگذر میں اُنھیں بکھیر دیا
کہ زیرِ خرمنِ مہتاب دفن ہو جائیں
رہیں حضورِ محبت رہینِ بے خبری
روایتوں کے اندھیرے میں جا کے کھو جائیں
لئے غبارِ رہِ ہجر جب قدم لوٹے
لرز رہا تھا افق پر ستارۂ سحری

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

مجازؔ مرحوم

میکشؔ اکبر آبادی

کسے خبر تھی کہ آج کی صحبتیں کل افسانہ بن جائیں گی اور مستزاد یہ کہ ہم میں ہی سے کسی کو خود ہی یہ افسانہ سُنانا پڑے گا مگر واقعہ یہ ہے کہ مجاز کی اور میری ملاقاتوں اور صحبتوں میں کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جس کا افسانہ بنایا جا سکے ہاں اُن کی زندگی میں کچھ راز ضرور تھے کیوں کہ جب وہ شام کو ہوسٹل سے شہر آنے کو ہوتے تو آدھ گھنٹے آئینے کے سامنے سنورتے رہتے۔ یوں تو شاید ہر آدمی کسی نہ کسی پہلو سے اپنے آپکو اچھا لگتا ہے اور جتنا اچھا لگتا ہے اس سے زیادہ اچھا بننے کی کوشش کرتا ہے خصوصاً جب وہ کسی کی نظر میں محبوب بننا چاہتا ہو۔ یہ مجھے بالکل نہیں معلوم کہ وہ کس کی نظر میں محبوب بننا چاہتے تھے۔

البتہ ایک روز ایسا ضرور ہوا کہ وہ شام کو حسبِ معمول میرے یہاں آئے اور ہم سب کی طرف پشت کر کے ایک مکان کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے مجھے یہ بات خصوصیت سے بُری معلوم ہوئی کیونکہ اس وقت کچھ ایسے لوگ بھی بیٹھے تھے جن کی میں عزت کرتا تھا اس لئے میں نے مجاز کو تنبیہ کی اور خلافِ عادت سخت لہجے میں تنبیہ کی مگر وہ بالکل خاموش رہے میں ان کی خاموشی سے ڈر گیا میں نے سوچا یہ بہت زیادہ خفا ہو گئے مگر ایسا نہ تھا وہ برابر آتے رہے اور انھوں نے بغیر معذرت کئے میری معذرت قبول کر لی ان کا انداز ایسا تھا کہ ان کا غصہ نفرت اور محبّت کچھ بھی ان کے چہرے سے محسوس نہ ہوتا تھا وہ ایک دھکتا ہوا انگارہ تھے جو راکھ میں دبا ہوا ہو۔ میں نے انھیں مختلف عمروں مختلف حالتوں اور مختلف ماحول میں دیکھا ہے۔ کبھی بے خود ہو کر قہقہہ مارتے نہیں دیکھا کبھی غصے میں آپے سے باہر نہیں دیکھا اور کبھی غم میں

بے حال نہیں پایا ان کے ہاتھ اکثر لرز جاتے تھے اور ان کی آنکھیں ضرور سب کچھ کہہ دیتی تھیں۔

ان میں دوستوں کو نوازنے اور انھیں یاد رکھنے کا بھی جوہر تھا ایسے کتنے ہی لوگ میرے پاس آتے رہے ہیں جو مجاز کے ذریعے سے میرے ملنے کے مشتاق ہوئے وہ میرے یہاں کی صحبتوں کا ذکر بھی اکثر کرتے رہتے تھے ان صحبتوں کی کیا باتیں انھیں یاد آتی تھیں مجھے نہیں معلوم وہ مجھے برابر وہ رسالے بھیجتے رہے جن سے ان کا تعلق رہا۔

مجاز سے میری ملاقات کی ابتدا کب اور کس طرح ہوئی مجھے یاد نہیں ان کی آمد بالکل اس طرح ہوئی تھی جس طرح ایک مصرع کے بعد بغیر سوچے ہوئے دوسرا مصرع ہو جائے پہلا مصرع جذبی تھے اور دوسرا مجاز۔ وہ جذبی صاحب کے ساتھ آئے اور پھر جب تک آگرے میں رہے آتے ہی رہے۔

جذبی صاحب سے میری ملاقات ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ انجمن ترقی اردو سینٹ جانس کالج آگرہ کا طرحی مشاعرہ تھا۔ فرسٹ ایر کے ایک نوعمر طالب علم نے جگر کی دھن میں کڑکتی ہوئی آواز سے غزل پڑھی اور سارے مشاعرے پر چھا گیا میری غزل بھی بہت کامیاب رہی اور اس طرح ہم دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوئے اور دوسرے ہی دن بے تکلف دوست۔ یہ سابق ملال اور حال کے جذبی صاحب تھے پھر کچھ روز بعد جذبی صاحب کے ساتھ ایک اور صاحب ملے۔ دبلے پتلے منحنی سے لباس اور وضع سب سجل اور درست مگر مجبوری یہ تھی کہ گال پچکے ہوئے اور جوانی کی بھی کوئی کشش ان میں نہ تھی یہ مجاز صاحب تھے شعر بھی معمولی سا کہتے تھے اور پڑھنا بھی خدا کا نام تھا بولتے بھی بہت نہ تھے اور چہرے سے بھی دل کی آگ کا پتہ نہ چلتا تھا ہاں آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی وہ ایسے لگتے تھے جیسے کوئی خفیہ پولیس کا آدمی ہو۔ تقریباً روزانہ شام کو جذبی صاحب کے ساتھ آتے گپیں لگتیں ہنستے ہنساتے اور چلے جاتے کبھی کبھی شعر و شاعری بھی ہو جاتی مگر صحبت کا اصل موضوع تو ہنسنا ہنسانا اور بنا بنانا ہی تھا شام کی صحبت میں یہی کام سنجیدگی کیساتھ کیا جاتا تھا کام کے لیے سارا دن پڑا تھا کام تو یہ لوگ کرتے تھے میرے لیے تو سنجیدگی سے ملاقاتیوں سے ہم کلام ہونا اور ان کے مذاق کا لحاظ رکھنا ہی بڑا کام تھا مختلف مذاق اور مختلف عمر کے لوگوں کو مطمئن کرنا بڑا فن بھی ہے اور بڑی ریاکاری بھی اور میں اس فن اور ریاکاری دونوں میں

ناقص ہوں اس لیے شاعری کی اس مجلس کا دن بھر انتظار رہتا جہاں نہ سوچ کر بات کی جاتی تھی اور نہ بات کر کے سوچنا پڑتا تھا مگر مجاز تو اس وقت بھی ایسے ہی معلوم ہوتے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں ان کی فطرت عجیب تھی ذکی بے تکلفی ان کے مذاق اور ان کی ہنسی سب کی ایک حد تھی معلوم نہیں سب کے ساتھ وہ ایسے تھے یا میرے ہی ساتھ یہ معاملہ تھا یہ خیال اس لیے پیدا ہوا کہ جب انھوں نے علانیہ شراب نوشی شروع کر دی تھی تب بھی وہ مجھ سے حجاب رکھنے کی کوشش کرتے رہے ایک بار وہ میرے یہاں جوش صاحب کے ساتھ آئے اور جوش صاحب نے مجھ سے ان کا یہ حجاب توڑنے کی کوشش کی اور کامیاب بھی ہو گئے مگر پھر اس کے بعد ہمیشہ اپنی پرانی وضع اور روایت کا لحاظ رکھتے رہے نہ کبھی میرے سامنے پی اور نہ کبھی یہ ظاہر ہونے دیا کہ وہ پیے ہوئے ہیں ان کا رکھ رکھاؤ یکساں ہی رہا یہاں تک کہ جب ان کا دماغی توازن خراب ہونے کو تھا مگر محسوس نہ ہوا تھا تب بھی وہ میرے یہاں آکر ٹھہرے ان کا انداز وہی تھا یہ ضرور ہوا کہ انھوں نے میری ٹوپی دیکھتے ہی اپنی ٹوپی پھینک دی اور میری ٹوپی مانگ کر پہن لی کہنے لگے میری ٹوپی بہت خراب ہو گئی ہے ان کی ٹوپی واقعی خراب ہو گئی تھی میں نے کہا میرے وہ فلاں دوست ہیں نا! ان کی ایک ترکی ٹوپی تھی وہ بہت میلی ہو گئی جہاں کہیں وہ ٹوپی چھوڑ آتے صاحب خانہ انھیں واپس کر دیتا آخر ایک روز وہ آگرہ فورٹ اسٹیشن گئے اور ٹوپی ہاتھ میں لیے ٹہلتے رہے جب گارڈ نے سیٹی دی اور ٹرین چل نکلی تو انھوں نے ٹوپی ایک خالی ڈبے میں ڈال دی اور کھڑے ٹرین کو دیکھتے رہے جب گاڑی نظر سے غائب ہو گئی تب وہاں سے ہٹے مجاز ہنسنے لگے۔

اس روز وہ دن بھر میرے پاس رہے اور پھر غائب ہو گئے میں ان کا انتظار کرتا رہا آخر معلوم ہوا کہ میڈیکل کالج کے طالب علموں کے ہاتھ پڑ گئے ہیں وہ پلا دیتے ہیں اور گھنٹوں غزلیں سنتے رہتے ہیں۔

میری یہ عادت نہیں ہے کہ میں اپنے شاعر دوستوں سے کچھ سنوں یا انھیں سناؤں مجھے ان کی باتوں میں زیادہ لطف محسوس ہوتا ہے۔ مجاز بھی خواہ مخواہ شعر سنانے کے عادی نہ تھے اور سچ یہ ہے کہ میں برسوں اس فیصلے پر قائم رہا ہوں کہ مجاز نہ کامیاب شاعر ہو سکتے ہیں نا کامیاب عاشق اور یہ کہ وہ جنبی کی دیکھا دیکھی

شعر کہتے ہیں ان کے شعر سن کر اکثر دل میں کہا کرتا عجیب سے کس نے کہدیا ہے کہ شاعری کے ساتھ زبردستی کرے۔ مگر جب مجاز نے اپنی نظم آوارہ لکھنی شروع کی اور اس کے چند بند مجھے سنائے تو میں نے سنجیدگی سے ان کی ہمت افزائی کی اور مجھے محسوس ہوا کہ اب شاعری نے مجاز سے زبردستی شروع کردی ہے پھر بہت دن بعد ایک روز ایسا ہوا کہ مجاز جوش کے ساتھ آئے ہم تینوں اکیلے بیٹھے ہوئے تھے کسی طرح نظمیں شروع ہو گئیں ایک کے بعد ایک نظم سُناتا مجاز نے ایک نظم سنائی جو کسی نرس پر لکھی تھی میں نے کہا اس عنوان پر میری نظم سنیے مجاز نے سنکر کہا آپ کی نظم میری نظم سے اچھی ہے جوش صاحب نے بھی تائید کی جوش نے کہا مجاز وہ رات اور ریل انھیں سناؤ مجاز رات اور ریل سنانے لگے میں حیرت زدہ مجاز کا منھ تک رہا تھا جوش جھوم رہے تھے اور مجاز لہک لہک کر نظم سنا رہے تھے ان کی آواز معمول سے زیادہ کپکپا رہی تھی میں نے اس روز مجاز کو صرف شاعر ہی تسلیم نہیں کیا بلکہ میں واقعی ان سے مرعوب بھی ہو گیا اور مجاز اس بات پر مسرور تھے بہت مسرور۔

مجاز سے میری آخری ملاقات دہلی کالج کے مشاعرے میں ہوئی تھی یہ مشاعرہ غالباً ۱۹۵۱ء میں پروفیسر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب کے اہتمام سے ہوا تھا اس میں مجاز بھی شریک تھے اور جوش صاحب بھی مگر دونوں علیحدہ علیحدہ سے تھے میں جوش کے ساتھ تھا مگر مجاز سے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہو رہی تھیں وہ بڑی محبت سے میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔
سگریٹ کا کش پیتے اور میرا یہ شعر پڑھتے اور مسکراتے۔

کبھی تو سینکڑوں سجدے ہیں مہ جبینوں کو
کبھی اُٹھا کے نظر ان کو دیکھتا بھی نہیں

مجاز — میرا بھائی

حمیدہ سالم

مجاز میرا بھائی ایک ڈرامائی انداز سے اس زندگی میں ابھرا اور اسی انداز سے ڈوب گیا۔ اس کی زندگی امنگوں حوصلوں سے بھرپور شروع ہوئی اور محرومیوں مایوسیوں میں گھر کر ختم ہو گئی وہ زندگی کو روشن سے روشن تر دیکھنے کی تمنائیں پالتا رہا اور اس کی اپنی زندگی دھیرے دھیرے تاریک سے تاریک تر ہوتی گئی۔ اس نے زندگی کو اپنی تخلیقی قوتوں کا قیمتی سرمایہ سونپا۔ اپنی شاعری دی جس میں کائنات کو حسین بنانے کے حوصلے ہیں۔ مستقبل کو سنوارنے کی امنگیں ہیں جوانی کی جولانی ہے تجربہ کا شعور ہے ہوش مندی ہے۔ تڑپ ہے شوریدہ سری ہے حسن ہے نفاست ہے۔ سادگی ہے پرکاری ہے اور زندگی نے اسے پریشانیاں دیں پشیمانیاں دیں۔ الجھنیں دیں بے چینی دی وہ زندگی سے محبت مانگتا رہا مسرت مانگتا رہا سکون چاہتا رہا آسودگی چاہتا رہا اور زندگی رفتہ رفتہ اس سے دور کھنچتی گئی، یہاں تک کہ زندگی کی کھیتی کو خون دل سے سینچنے والے شاعر کو موت کی آغوش میں پناہ ملی۔

مجاز کی زندگی اور مجاز کی شخصیت کی کمزوریوں اور خوبصورتیوں کو سمجھنے کے لیے اس پس منظر سے تھوڑی سی واقفیت ضروری ہے جس کے ساتھ مجاز کی زندگی شروع ہوتی ہے مجاز اودھ کے ایک مشہور قصبہ ردولی کے ایک کھاتے پیتے خاندان میں پیدا ہوئے یہ خاندان اور یہ قصبہ جس میں مجاز نے جنم لیا دونوں ہی کچھ اپنی خصوصیات رکھتے تھے۔ زمینداری کے خاتمے سے پہلے ردولی کی تمام تر آبادی زمینداروں اور تعلقداروں پر مشتمل تھی۔ وہاں کے ماحول میں جاگیردارانہ

نظام کی تمام خوبیاں اور خامیاں سمٹی ہوئی تھیں بظاہر وہاں کا کلچر اور تہذیب کی سطح بہت بلند تھی وہاں کی زندگی میں سلیقہ تھا خوش مذاقی تھی۔ لوگ اچھا کھاتے تھے اچھا پہنتے تھے۔ رکھ رکھاؤ میں وضعداری میں خاطر تواضع میں یقین رکھتے تھے پرانی روایتوں سے آخر دم تک چمٹے رہنے میں اعتقاد تھا۔ رسم ورواج کی پابندی ایمان تھا۔ دکھاوے اور نمائش کو اہمیت حاصل تھی۔ ہر خوشی اور غم کے موقعہ پر دھوم دھام کی تقریبیں ضروری تھیں۔ ہر تہوار پر برادری بھر میں حصہ بٹنے لازمی تھے۔ یہ ڈھانچا زمینداری کی کمزور بنیادوں پر کب تک کھڑا رہتا۔ آخر کو بیٹھ گیا۔ اور آج رودلی میں سوائے عمارتوں کے کھنڈر اور افسردہ و اداس چہروں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مجاز کو اپنے وطن سے بہت محبت تھی۔ اپنے بچپن کی ہر یاد انھیں عزیز تھی اس خود فراموشی کے عالم میں بھی جب کبھی اماں ان کے بچپن کی رودلی کا ذکر چھیڑتیں وہ بہت دلچسپی سے اس میں حصہ لیتے۔ ہر چھوٹے بڑے کو پوچھتے۔ اب سے آٹھ دس سال پہلے تک وہ اکثر رودلی جایا کرتے تھے لیکن اب باوجود اصرار کے بھی وہ وہاں نہیں جاتے تھے انھیں اپنے وطن کے زوال پر بہت دُکھ تھا۔

ہمارے دادا چودھری احمد حسین گو کہ تھے متوسط درجہ کے زمیندار لیکن اپنی سمجھ بوجھ اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے قصبہ بھر میں مشہور تھے۔ ان کے سات اولادیں تھیں چار بیٹے اور تین بیٹیاں سب کے سب ذہین اور طباع تھے۔ یہانتک کہ معاملہ فہمی اور کارگذاری میں اس خاندان کی بیٹیاں اس قدر مشہور تھیں کہ قصبہ میں اب تک ان کی مثال دی جاتی ہے۔ جہاں تک تعلیم کا سوال تھا مسجد کے مکتب تھے اور کھاتا پیتا خاندان گھر میں مولوی رکھتا تھا غرضکہ عربی فارسی کی تعلیم اور حساب سے اتنی واقفیت کہ زمینداری کا پیشہ کامیابی سے چلایا جا سکے یہ تھا معیار۔ دادا کی دو دو اولادیں بچپن ہی سے کچھ مختلف اور ذرا غیر معمولی سی طبیعتیں رکھتی تھیں۔ ایک تو میرے چچا بہت ہی بے خبر مدہوش رنگین مزاج آزاد منش۔ دوسرے میرے والد بہت ہی سنجیدہ بردبار کم سخن محنتی اور مرنجان مرنج قسم کے انسان تصوف پرستی کا رنگ طبیعت پر غالب۔ دادا کو ان دونوں ہی کی طرف سے پریشانی تھی۔ میرے چچا تو قابو میں آنہ سکے ان کا پڑھنے لکھنے میں بالکل دل نہ لگا گو کہ

کہتے ہیں کہ سب بھائی بہنوں میں سب سے زیادہ ذہین اور تیز وہی تھے - باپ کی زندگی میں چھپ چھپکر اور ان کے بعد کھلم کھلا جائداد کی پائی پائی بیچ کر خوب خوب طوائف بازی کی اور رنگ رلیاں منائیں کہتے ہیں کہ اس خاندان کی ہر نسل میں ایک بہکا ہوا فرد ضرور ہوا ہے اور اس کے ساتھ ایک خوبصورت روایت ہے کبھی خاندانی جنات دادا کسی کی دلہن اُڑا لائے تھے- ایک منچلا لڑکا بار بار جاتا اور کہتا جنات دادا دلہن دکھاؤ - جنات دادا آخر کو جھنجھلا اُٹھے اور ایک کنکری اُٹھا کر پھینکی جو اس لڑکے کے ماتھے پر لگی - اسوقت سے اس خاندان کی ہر نسل میں ایک دیوانہ پیدا ہونے لگا - میرے والد دنیا کے بکھیڑوں میں پھنسا ہی دیے گئے - چودہ برس کی عمر میں چچا زاد بہن سے شادی کر دی گئی لیکن ان کی علم دوستی میں فرق نہیں آسکا - اتفاق سے اسی زمانہ میں ایک تعلقدار گھرانے میں فیض آباد سے آئے ہوئے ایک انگریزی داں استاد رکھے گئے تھے - والد نے ان سے استفادہ اُٹھایا اور زیادہ تر اپنی لگن کے نتیجہ پر پرائیوٹ طور پر میٹرک کا امتحان پاس کیا - قصبہ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلو واقعہ تھا - دادا کی بھی ہمت بڑھی والد لکھنؤ بھیجے گئے اور کچھ اپنی کاوش اور کچھ گھر والوں کی مدد سے تعلیم کا انتظام ہوا - بی اے ایل ایل بی تک کی نوبت آئی تعلیم ختم کرنے کے بعد سرکاری ملازمت کی - ردولی کے یہ پہلے شخص تھے جنھوں نے زینداری کے باوجود کسی دوسرے پیشے کو اپنایا غرض کہ مجاز اس ابھرتے ہوئے خاندان میں پیدا ہوئے - جو ایک طرف تو پرانی قدروں کو سینہ سے لگائے ہوئے تھا دوسری طرف نئی قدروں کو بھی اپنا رہا تھا - اس خصوصیت کی جھلک مجاز کی شخصیت میں بھی تھی اور کلام میں بھی - ہماری ماں اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں - بالکل ان پڑھ لیکن بہت تیز ذہن زمانہ شناس - فطرتاً شوقین مزاج تفریح پسند اور طبیعت پر جذباتیت کا رنگ غالب - مجاز کی شخصیت میں ماں باپ دونوں کی خصوصیات کا ملا جلا رنگ تھا باپ کی طرف سے نیک نیتی کم سخنی حقیقت پسندی اور طبیعت کی گہرائی پائی ماں کی طرف سے طبیعت میں حسن پرستی اور بے حسی اثر پذیری اور جذباتیت ملی - کاش ان کے حصہ میں باپ کی طبیعت کا ٹھہراؤ استقلال اور ارادے کی مضبوطی ہوتی - لیکن ان کی زندگی کو تو یوں بکھرنا تھا - زمانہ کو تو حالات کے ہاتھوں

فنکار کی موت کے تماشے دیکھنے تھے ان کی طبیعت میں وہ مضبوطی نہ تھی جو ان کے دل ودماغ کی نزاکت کو ڈھال بن کر محفوظ رکھ سکتی۔

مجاز اکتوبر ۱۹۱۱ء میں مبارک سلامت کی صداؤں کے درمیان پیدا ہوئے۔ ان سے بڑا ایک بچہ دو ڈھائی سال کی عمر میں ختم ہو چکا تھا۔ اس لیے یہ بہت لاڈ اور منتوں مرادوں سے پالے گئے۔ محرم کی ساتویں کو فقیر بنتے دسویں کو پایک بنتے ایک کان میں بندا ڈالا گیا جو سات سال کی عمر میں اجمیر شریف لے جا کر اتار اگیا۔ ہر بیماری پر صدقے اترتے خیراتیں ہوتیں۔ نو دس سال کے ہوئے کہ اٹھارہ سالہ بڑے بھائی کا درخت سے گر کر انتقال ہو گیا پھر کیا تھا ماں ور نانی دیوانہ وار ان کو تمام حوادث اور خطرات سے بچانے کی ہر ممکن کوشش میں لگ گئیں مجال نہ تھی کہ گھر سے اکیلے باہر قدم نکال لیں ہر وقت ایک نوکر ان کے ساتھ رہتا تھا۔ عمر کے آخر دن تک کوئی صبح ایسی نہ گذری جب ماں نے ان کے لیے دو رکعت شکرانہ کی نہ پڑھی ہوں۔ اب سے چھ سات سال سے دو آنہ روزانہ رات ان کے سرہانے رکھے جاتے جو صبح خیرات کر دیے جاتے غرض کہ ان کی ہر سانس کے ساتھ ماں کی دعائیں وابستہ تھیں اور ہر قدم کے ساتھ تمنائیں اور آرزوئیں بچپن سے ہم سب نے یہ محسوس کیا گویا ماں کی زندگی کا محور وہی ہوں ان حالات میں ہم بھائی بہنوں کے دل میں ان کی طرف سے رقابت کا جذبہ پیدا ہونا ضروری تھا۔ لیکن یہ ان کی اپنی طبیعت کی سادگی معصومیت اور خلوص تھا جو ایسی بدمزگی کی فضا گھر میں نہ پیدا ہو سکی ماں نے انکی پرورش میں کتنی راتیں جاگ جاگ کے گزاری ہیں آنیوالی مسرتوں کے خواب دیکھے ہیں اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ انکی عرفیت جگن اسی بنا پر پڑی کہ بچپن سے راتوں کو جاگنے کی عادت تھی کسے معلوم تھا کہ بچپن کی یہ شب بیداری اور بے چینی آخر عمر تک ان کا ساتھ دے گی۔

جگن بھیا بچپن سے بلا کے شریر اور بے خبر تھے بہنوں کو چھیڑنا بھائی سے لڑنا سب کے مٹھائی کے حصے چھپ چھپ کر کھا لینا۔ کھلونوں کو توڑ پھوڑ کر ان کے اندر کی ماہیت سے واقف ہونا گلی ڈنڈا اور ڈھول دھپا ان کے محبوب مشغلے تھے۔ آپا میری کاٹی ہوئی پان سے بہت بڑی تھیں سو ان سے

ڈرتے تھے اور اُن کے رعب میں رہتے تھے۔ ان کا برتاؤ بھی بہن سے زیادہ ماں کا سا تھا۔ صفیہ آپا اور انصار بھائی سے انکا اور پرتلے کا سا معاملہ تھا بچپن میں ایک منٹ بھی تو ان تینوں کی آپس میں نہ بنتی صفیہ آپا کی گڑیوں کی چُٹیا پکڑ کر نچانے میں انھیں خاص لطف ملتا تھا۔ غرضکہ ہر وقت ان تینوں کے مقدمہ پیش ہوتے رہتے تھے۔ پر فیصلہ زیادہ تر جگن بھیا کے ہی حق میں ہوتا تھا کیونکہ ابا کے علاوہ کوئی بھی غیر جانبدارانہ طور پر فیصلہ نہیں دیتا تھا۔ جگن بھیا سب ہی کے لاڈلے تھے اور ابا ملازمت کے سلسلہ میں لکھنؤ رہتے تھے جب تعطیل میں آتے تو جگن بھیا کا رنگ ہی بالکل بدلا ہوتا ابا کا ایک حد تک روایتی ادب لحاظ انھوں نے اپنی عمر کے آخر لمحہ تک کیا۔ دیوانگی کے دور بھی گذرے لیکن ابا کے سامنے کبھی انھوں نے سگریٹ نہیں پی یہاں تک کہ ان کے سامنے اپنا کلام بھی نہیں سناتے تھے۔ میں ان سے بہت چھوٹی تھی۔ میری طرف ان کا رویہ بالکل مختلف تھا۔ مجھے بہت چاہتے تھے۔ دوسروں کی مٹھائی چراتے اور مجھے کھلاتے۔ میری پرورش میں ماں کا ہاتھ بٹاتے۔ ماں کے بعد میں انھیں سے مانوس تھی ہر وقت ان سے چمٹی رہتی۔ میرا نام بھی انھوں نے ہی رکھا۔ اس کے ساتھ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ جگن بھیا بچپن ہی سے بہت حسن پرست تھے کوئی خوبصورت بی بی دیکھ لیں پھر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اس کے پاس گھنٹوں بیٹھے رہتے کھیل کود کھانے پینے کسی چیز کا ہوش نہ رہتا۔ میری پیدائش کے وقت لکھنؤ سے ایک خوبصورت دُلہن ردولی بیاہ کر آئیں۔ ان کا نام حمیدہ تھا۔ ان کے پیچھے جگن بھیا کا دیوانگی کا عالم تھا۔ میرا نام ذکیہ رکھا گیا تھا۔ ضد کر کے بدلا اور حمیدہ رکھ دیا جانے محض چاہت میں یا اس امید پر کہ شاید نام ہی کی لاج کی خاطر میں حسین نکل جاؤں۔ بڑھ کر میں اکثر ان سے لڑتی تھی کہ چہرہ کی خوبصورتی الگ رہی مجھے نام کی خوبصورتی سے محروم کر ڈالا ہنستے تھے اور کہتے تھے ارے پگلی خوبصورتی کہیں ناک آنکھ کی ہوتی ہے اصل خوبصورتی تو دل کی ہے جو چہرہ پر دکھتی ہے میں پانچ سال کی تھی کہ مجھے چیچک نکلی اور اس غضب کی کہ سارا جسم دانوں سے لد گیا ایسی حالت میں جو گھناؤنا عالم رہا ہوگا اس کا اندازہ ہو بھی سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دور سے بو آتی تھی ابا نے احتیاطاً سب بچوں کا میرے پاس آنا منع کر رکھا تھا۔ لیکن جگن بھیا چھپ چھپ کر میرے پاس

پہونچ جاتے۔ میرے دانوں پر نیم کی پتیوں سے کھجلی کرتے۔ مجھے کہانیاں سناتے لطیفے سناتے آخر کو انھیں منع کرنا ہی چھوڑ دیا گیا۔ آج میں سوچتی ہوں کہ ان کے دل میں کتنی نرمی تھی۔ کیسا گداز تھا طبیعت میں کتنا خلوص تھا کتنی ہمدردی تھی جو وہ میرے گھناؤنے قرب کو اپنی دلچسپیوں اور تفریحوں پر ترجیح دیتے تھے۔ ویسے بھی بیماروں کی تیمارداری کا انھیں بڑا ہنر تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی بیمار ہوتا تو دوا پلانے کی ذمہ داری انھیں کے سر ہوتی اور خاندان کا یہ بے خبر لاابالی اور لاخیرا بچہ اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کو پوری کامیابی کے ساتھ سنبھالتا۔

ھگن بھیا کی طبیعت میں بچپن ہی سے ایک قسم کی معصومیت اور سادگی تھی جسکی وجہ سے وہ سب کو عزیز تھے۔ جاگیردارانہ ماحول میں ملکیت کا احساس بچے کی گھٹی کے ساتھ سرایت کرتا ہے لیکن وہ فطرتاً بے خبر اور لاابالی تھے۔ دوسروں کی چیز اپنے تصرف میں لے آنا اپنی چیز دوسروں کو دے دینا ان کی عادت رہی گھر کے نوکروں چاکروں سے ان کی بھائی برادری کے تعلقات تھے۔ ایک گھر کا پلا ہوا نوکر شرف الدین سے ان کی بہت گہری پٹتی تھی۔ وہ ان کے گلی ڈنڈے کا ساتھی تھا جوان ہو کر اس نے دوسری جگہ نوکریاں کیں لیکن اکثر وہ بڑے بھیا سے ملنے آیا کرتا۔ غرضکہ بچپن ہی سے وہ کچھ غیر معمولی تھے۔ ایک کان کچھ خراب رہتا تھا۔ اس لیے ذرا اونچا سنتے تھے۔ میرے ایک ماموں نے انھیں بنک بہرے او" کہتے تھے۔ ایک چچا انھیں سڑے او" کہتے تھے اور کچھ سنکی۔ یہ نام سولہ سترہ سال کی عمر تک رائج رہے یہانتک کہ ماں نے صدائے احتجاج بلند کی کہ اب لڑکا جوان ہوا ہے اسے سڑی سنکی کہنا مناسب نہیں۔

شوخ شریر اور بے خبر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ذہین تھے اور پڑھائی میں ہوشیار حساب میں بہت تیز تھے۔ جماعت میں ہمیشہ اچھے طالب علموں میں شمار ہوا۔ ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ کھیل کود کی وجہ سے گھٹنے ہمیشہ زخمی رہتے تھے اور ماں بے چاری نئے نئے پاجاموں میں پیوند لگاتے لگاتے اور رفو کرتے کرتے عاجز تھیں۔ لانگ جمپ اور ہائی جمپ کی مشق ہر وقت ہوتی رہتی تھی۔ گھر کے نہ جانے کتنے پلنگ ان کی اس مشق کی نذر ہوتے تھے

پلنگ کھڑے کر کر کے ان پر سے کودتے تھے۔ غرضکہ گھر میں ہم سب کے لیے ہر وقت وہ تفریح کا اور دلچسپی کا سبب بنے رہتے۔

پڑھائی میں ہوشیار ہونے کے ساتھ ساتھ پڑھانے کا بھی سلیقہ تھا۔ ہم دونوں بہنوں کی تعلیم میں انھوں نے بہت دلچسپی لی۔ صفیہ آپا کو انگریزی انھوں نے ہی شروع کروائی۔ میری تو درس و تدریس کی تمام ذمہ داری انھیں کے سر تھی اور اس سلسلہ میں ایک واقعہ کی یاد کا نقش میرے ذہن پر بہت گہرا ہے۔ میرا پڑھنے میں بالکل دل نہ لگتا تھا۔ نہ جانے کتنے قاعدے میرے لیے آئے ہوں گے اور میں الف زبر آ اور بے زبر با سے آگے نہ پڑھ سکی جانے میں غائب کر دیتی تھی یا غائب ہو جاتے تھے میری تمام دلچسپی گڑیوں ہنڈکلیوں یا پھر سہلیوں کے ساتھ محلہ بھر میں گھومنے میں تھی۔ ایک دن جب استانی جی نے میری طرف سے بالکل مایوسی کا اظہار کیا تو ماں نے بہت ہی رقت آمیز لہجہ میں مجھے سمجھایا کہ نہ میری شکل نہ صورت آخر پڑھو لکھو گی نہیں تو پھر کہاں کھپو گی۔ تصوّر بہت خوفناک تھا میں نے رونا شروع کر دیا جگن بھیا اس منظر سے بہت متاثر ہوئے فوراً اٹھے اور ردی والے صندوق سے ایک بادامی بادامی رنگ کا قاعدہ نکال کر لائے اور استانی جی سے میرا پڑھنا ختم کروا کر خود پڑھانا شروع کیا۔ بس اس دن سے میں چل نکلی کہہ نہیں سکتی کہ ان کے پڑھانے کا ڈھنگ تھا یا ہم دونوں کے درمیان کا جذباتی بندھن بہر حال وجہ کچھ بھی ہو اس دن سے پڑھائی میں میری بدلی اور بدشوقی ختم ہو گئی جس وقت تک میرا اسکول میں داخلہ نہ ہوا وہی مجھے پڑھاتے رہے۔ اردو انگریزی حساب سب ہی کچھ ان کی ذمہ داری تھی۔ چھوٹے موٹے مضمون لکھواتے اور سب کے سامنے پڑھوا پڑھوا کر سنتے اور بہت خوش ہوتے لیکن اسے بھی فطرت کی ستم ظریفی ہی سمجھئے میرا رجحان ان کے مذاق کے بالکل برعکس رہا بی اے کے بعد ان کا بہت اصرار تھا کہ میں ایم اے میں اردو لوں لیکن مجھے اپنے ادبی مذاق کے متعلق کوئی خوش فہمی نہ تھی سو میں نے معاشیات کا انتخاب کیا جگن بھیا کو اس وقت مجھ سے خاصی مایوسی ہوئی۔

غرضکہ جگن بھیا نے جب بچپن سے جوانی میں قدم رکھا ان کا شمار ہونہار نوجوانوں میں ہوا۔ جائداد تھی گھر تھا۔ باپ سرکاری ملازم تھے۔ شکل وصورت تھی صحت تھی۔ تعلیم تھی کیا کمی تھی۔ ہر لڑکی والے کی نظر ان پڑتی۔ شادی کی باتیں شروع ہوئیں نانی کی خواہش تھی کہ دلہن کم عمر ہو۔ ماں کی تمنا تھی کہ بہو خوبصورت ہو۔ بہنوں کی آرزو تھی بھاوج پڑھی لکھی ہو۔ باپ نے کہا کہ بیٹا جب تک تعلیم سے فراغت حاصل کرکے اپنے پاؤں پر نہ کھڑا ہو شادی کا کوئی سوال نہیں نانی اور ماں دباؤ میں آکر چپ ہوگئیں۔ بہنوں نے باپ کی بات کا وزن محسوس کیا اور معاملہ دب گیا۔ جن لوگوں کے دلوں میں جگن بھیا کو داماد بنانے کی آرزو تھی ان کے دلوں میں رنجش نے جگہ لی۔ رویہ اور رجحان بدلنے لگے جگن بھیا کی رنگین مزاجی اور حسن پرستی۔ ہم عمر لڑکیوں اور بھاوجوں سے چھیڑ چھاڑ دلچسپی جو ان کے حسن اخلاق کی دلیل سمجھی جاتی تھی اب ان کی آوارگی سمجھی جانے لگی ان کے لاابالی پن کا جو ان کی معصومیت کا ثبوت سمجھی جاتی تھی غیر ذمہ داری میں شمار ہوا۔ دھیرے دھیرے عیب جوئی و نکتہ چینی کے لیے زیادہ سے زیادہ مواد فراہم ہوتا گیا اور خاندان کا یہ محبوب نوجوان محض شرابی کی صورت اختیار کرکے رہ گیا

جگن بھیا نے میٹرک امین آباد ہائی اسکول سے کیا۔ اسی زمانہ میں ابا کا تبادلہ آگرہ کا ہو گیا تھا ۱۹۲۹ء میں سینٹ جانس کالج میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا۔ انجینرنگ کی لائن اختیار کرنے کے خیال سے ریاضی کا مضامین میں انتخاب کیا۔ آگرہ میں پڑوس فانی کا ملا۔ اور کالج میں جذبی کا ساتھ ہوا طبیعت کا فطری رجحان جو ابتک اپنے کمروں کو پھولوں کے گلدان سے سجا کر رکھنے، بچوں کو ڈرائنگ بنا کر دینے، دیوالی پر میرے لیے گھروندا سجانے اور اچھی صورتیں دیکھ کر خوش ہونے پر مطمئن تھا۔ ابھرا اور اپنا صحیح راستہ ڈھونڈھنے پر مائل ہوا شاعری کا دور شروع ہوا۔ ۱۹۳۳ء میں ہم لوگ انھیں بورڈنگ چھوڑکر علی گڈھ آگئے یہاں سے ان کی زندگی کا پہلا موڑ شروع ہوا وہ خود بھی اس موڑ پر کچھ دفعہ حیران پریشان ٹھٹک کر رہ گئے۔ پڑھائی میں ابتری پیدا ہونی شروع ہوئی۔ زندگی کا نظام درہم برہم ہونے لگا امتحان میں فیل ہوئے۔ خود بتلاتے تھے

امتحان کی کاپیاں بالکل سادی چھوڑ آتے تھے۔ رات رات بھر شعر و شاعری کی محفلیں گرم کرتے رہتے تھے صبح کو پرچہ کیونکر حل ہوتا وہ بھی حساب کا کمیٹی کا گھر والے پریشان ہو اٹھے۔ انھیں علیگڈھ لے آئے۔ مضامین بدلے گئے فلسفہ معاشیات اور اردو کا انتخاب ہوا دو سال حاضریاں پوری نہ ہو سکنے کے سبب امتحان نہ دے سکے اللہ اللہ کر کے ۳۵ء میں بی اے کیا۔ ایم اے میں داخلہ لیا پرانی روایتوں کے خلاف پریوس کے اسٹوڈنٹ ہونے کے باوجود میگزین کے اڈیٹر مقرر ہوئے داخلہ کے ایک دو مہینہ کے بعد دلی ریڈیو اسٹیشن سے آواز کی سب اڈیٹری کی جگہ نکلی بہی خواہوں نے مشورہ دیا کہ جگہ اچھی ہے۔ مذاق کے مطابق ہے مواقع بار بار نہیں آتے درخواست دی اور لے لئے گئے۔ علیگڈھ کے قیام کا دور جگن بھیا کی ادبی زندگی اور شعور کا روشن ترین دور ہے زیادہ تر اچھی نظمیں اسی زمانے میں کہیں سردار بھائی سبطے بھائی اور بھائی اختر ان سب کا ایک گروہ تھا۔ بہر حال یہ سب نام ایسے ہیں کہ علی گڈھ یونیورسٹی کی تاریخ انھیں بھلا نہیں سکتی، کوئی اچھا مقرر تھا کوئی چوٹی کا ادیب تو کوئی محبوب شاعر سب اپنے اپنے ہتھیاروں سے فرسودہ نظام سے لڑ رہے تھے اور نئی قدروں کو زندہ رکھنے میں منہمک تھے علی گڈھ میں ایک نیا شعور پیدا ہو رہا تھا ایک نئی زندگی ابھر رہی تھی۔ لیکن مقرر کبھی کبھی اپنی زبان درازی سے دوسروں کو تکلیف پہونچا جاتا ہے ادیب کے قلم کی نوک کی تیزی کبھی کبھی کھٹکنے لگتی ہے۔ لیکن شاعر۔ وہ تو دلوں کا رازداں ہوتا ہے وہ تو روح کا پیغامبر ہوتا ہے اس کی بولی میٹھی ہوتی ہے اس کا پیام سچا ہوتا ہے پھر مجاز ـــــ جس کے یہاں "شمشیر کی صلابت اور ساز و جام کا گداز، دونوں ہی ہیں جس کے دل میں باغی کی آگ۔ جس کی رگوں میں جوانی کا جوش جس کے گلے میں نغمہ سنج کا وفور تھا۔ جس نے انقلاب کے نعرہ لگانے کے بجائے انقلاب کے راگ گائے جس نے علیگڈھ کو اپنا چمن قرار دیا اور ایسا چمن جہاں

ہر آن یہاں صہبائے کہن ایک ساغر نو میں ڈھلتی ہے
کلیوں سے حسن ٹپکتا ہے پھولوں سے جوانی ابلتی ہے
تدبیر کے پائے سنگین پر جھک جاتی ہے تقدیر یہاں
ذرات کا بوسہ لینے کو سو بار جھکا آکاش یہاں

یہ بلبل اپنے چمن میں سب ہی کو عزیز تھا - استادوں کا منظور نظر اور طلباء کیلیے باعث فخر - گرلس کالج میں ہر زبان پر اس بلبل کے راگ تھے - عورت کو نکتہ داں بتانے والا شاعر لڑکیوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا مجاز کی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں اس کا قد کتنا اچھا ہے وہ کیا کرتا ہے - کہاں رہتا ہے کسی سے محبت تو نہیں کرتا یہ لڑکیوں کے محبوب موضوع تھے -

جگن بھیا دلی گئے اور ایک سال تک آواز کی سب ایڈیٹری کے فرائض انجام دیتے رہے ملازمت کے زمانے میں گھر کا ایک پرانا ملازم ان کے ساتھ جو سیاہ وسفید کا مالک تھا پہلی کو تنخواہ اس کے سپرد کر دیتے اور پلٹ کر نہ پوچھتے کہ کب اور کیسے صرف ہو رہی ہے - ان کا گھر مہمانوں اور ٹھہرنے والوں کی وجہ سے ہمیشہ کیمپوں کی صورت اختیار کئے رہتا - شاعر ہونے کی رعایت سے شراب کی عادت تھی ہی ریڈیو اسٹیشن کے ماحول میں اور بھی چمکی لیکن اسوقت تک مجاز شاعر محفل وفا مطرب بزم دلبراں تھا - اس کی زندگی "غرق شراب تند و تیز" نہ ہوئی تھی - وہ اب تک علیگڈھ کا شاعر تھا - دلی کا شرابی نہ تھا بہرحال ریڈیو اسٹیشن کی اندرونی پالٹکس اور یوپی وپنجاب والوں کی رسہ کشی نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ جگن بھیا ۱۹۳۶ء میں ملازمت ترک کر کے یہ کہتے ہوئے دلی سے رخصت ہوئے

رخصت اے دلی تری محفل سے اب جاتا ہوں میں
نوحہ گر جاتا ہوں میں نالہ بہ لب جاتا ہوں میں
جاتے جاتے تجھ سے اک پیماں کیے جاتا ہوں میں
اپنے عزم سرفروشی کی قسم کھاتا ہوں میں
تیری اس بزم میں لوٹ کر آؤں گا میں
آؤنگا اور باندازِ دگر آؤں گا میں

ریڈیو اسٹیشن کی ملازمت کے اس مختصر سے عرصہ میں ماں بہن چاند سی دلہن لانے کی فکر میں لگی ہوئی تھیں - تلاش جاری تھی - انتظامات ہو رہے تھے - یہانتک کہ نانوں نے انہوں کے لیے جوڑے - زیور - کپڑے لونگ کی تیلیاں پانیوں کے لیے شال و شالے خریدے گئے تھے

ادریس صرف چاندسی دلہن کا انتظار تھا کسے معلوم تھا کہ جگن بھیا کی زندگی کا یہ افق ہمیشہ ہی ابر آلود رہیگا یہ چاند کبھی نہ نکلے گا ماں کے خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوں گے بہنوں کی آرزوئیں کبھی برنہ آئیں گی۔ انسان کی ضرورت تشنہ ہی رہے گی شاعر کا تصور کاغذی ہی پیکر پہنے رہے گا جگن بھیا وقت سے بہت پہلے پیدا ہوے تھے۔ شاعر سے عقیدت رکھی جاسکتی ہے بہت سے بہت محبت کی جاسکتی ہے۔ پر شادی تو نہیں پیٹ روٹیوں سے بھرتا ہے اشعار سے تو نہیں۔

دلی کے قیام کے دوران جگن بھیا کے دل نے ایک ایسی چوٹ کھائی جس کا زخم ان کی زندگی میں کبھی نہ بھر سکا۔ مرہم اور پھاہے کا ذکر کیا۔ اس پر مزید چوٹیں لگتی۔ ہیں اور دھیرے دھیرے ان کا پورا وجود ایک ناسور بن کر رہ گیا۔ ان کے اپنے لیے گھر والوں کے لیے اور سماج کے لیے انھوں نے محبت کی ایسی گہری ایسی پائیدار کہ آخر لمحہ تک ان کے دم کے ساتھ رہی لیکن قسمت دیکھو ہاتھ بھی بڑھایا تو شجر ممنوعہ کی طرف ـــ دلی کے چوٹی کے خاندان کی اکلوتی بیٹی چنچل۔ البیلی اور خوب صورت لاڈو پیار میں پلی ہوئی۔ عیش وعشرت کی عادی۔ ایک عدد بھاری بھرکم شوہر کی ملکیت یا مالک جو کچھ بھی سمجھیے۔ یہ بیل منڈھے چڑھتی تو کیونکر۔ لیکن شاعر قدموں پر موتی بکھیر تا رہے۔ سر پر پھولوں کی بارش کرتا رہے اور بدلے میں چند مسکراہٹوں کا خواہشمند ہو تو سودا مہنگا تو نہیں شاعر بھی اپنی جگہ پر مطمئن تھا کہ ؎

میرا نغمہ باعث دلداری خوباں تو ہے
میرا نالہ خیر سے وجہ نشاط جاں تو ہے

لیکن بُرا ہو اس سماج کا۔ اس کی ٹیڑھی ترچھی سخت نگاہوں کا۔ اس کی انگشت نمائی کا ہر کھیل بگڑ کر رہ جاتا ہے انسان کی آہ کا ذکر کیا شاعر کی واہ بھی خطرے میں پڑ گئی۔ غریب انسان کا کہنا کیا گھٹ کر رہ گیا۔ بے چارے شاعر کا دل ٹوٹ گیا۔

یاس کا دھواں اُٹھا ہر نوائے خستہ سے
آہ کی صدا نکلی بربط شکستہ سے

بظاہر تو اتنا ہی ہوا لیکن قریب سے دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس کا پورا وجود سلگ کر رہ گیا اور سلگتے سلگتے ۱۹۴۰ء میں یہ آتش فشاں پھوٹ ہی نکلا۔ نروس بریک ڈاؤن کا یہ حملہ تھا آج بھی مجھے وہ دن یاد ہیں۔ میں انٹرمیڈیٹ میں پڑھتی تھی اور لکھنؤ ہی میں تھی صبح سے شام تک اخبار سناتے سناتے یا پھر شیلے اور کیٹس کے مجموعے سناتے سناتے میری زبان خشک ہوجاتی تھی ایک لمحہ کی خاموشی گوارا نہ تھی ایسا لگتا جیسے اندر شعلے اُٹھ رہے ہوں جنھیں باتوں کے چھینٹوں سے بجھانے کی کوشش ہو۔ بس یہ خبط تھا کہ فلاں فلاں مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اور رقیب روسیاہ زہر دینے کی فکر میں ہے۔ سوائے ہم چند کے کسی کا پاس آنا گوارا نہ تھا محبت میں ناکامی کا انجام پورے بھیانک انداز سے تماشے دکھا رہا تھا۔ علاج معالجہ ہوا۔ چار چھ مہینے کے لیے بڑی بہن کے ساتھ نینی تال چلے گئے اور خدا خدا کرکے تندرست و توانا ہوکر واپس آئے اور پھر نارمل زندگی بسر کرنے کی کوشش میں اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مارنے لگے۔ کچھ دن بمبئی انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں کام کیا۔ وہاں سے واپس ہوئے تو لکھنؤ یونیورسٹی میں ایل۔ ایل۔ بی میں داخلہ لیا۔ اسی زمانے میں 'نئے ادب' اور اس کے بعد 'پرچم' کی ادارات کرتے رہے۔ جب سب ساتھی ادھر ادھر بکھر گئے تو پھر دہلی واپس گئے اور ہارڈنگ لائبریری میں اسسٹنٹ لائبریرین کی جگہ پر کام کرنا شروع کیا۔ ماں بہنوں نے دل کی چوٹ کا علاج کرنا چاہا۔ صفیہ آپا کی دوستوں میں سے ایک کو جگن بھیا سے کچھ ہمدردی اور کچھ دلچسپی پیدا ہوئی۔ وہ اپنے گھر کے حالات سے کچھ غیر مطمئن بھی تھیں صفیہ آپا کی تحریک پر انھوں نے جگن بھیا کو اپنانے پر آمادگی ظاہر کی شکل وصورت کے اعتبار سے نہ حسینوں میں شمار ہو سکتا تھا اور نہ ہی بدصورتوں میں۔ پڑھی لکھی تھیں۔ برسر روزگار تھیں لیکن طبیعتاً گھریلو قسم کی تھیں۔ جگن بھیا سے محض صفیہ آپا کے توسط سے بس ایک دو دفعہ کی ملاقات تھی۔ دل کے ملاپ کا تو کوئی سوال نہ تھا لیکن جگن بھیا نے سوچا کہ شاید سپردگی ہی میں نجات ہو اور زندگی کے منتشر تار یکجا ہو سکیں زخم رسنا بند کر دے۔ جذبات کا تو دلی میں گلا گھٹ ہی چکا تھا۔ جانے کس دل سے اپنے کو سمجھا کے سپرد کر پائے ہوں گے۔ بہر حال اس رشتے پر راضی ہو گئے اور بات ماں تک پہنچی کہ ایک دفعہ ...... کے سرپرست سے مل لیں اور معاملہ طے ہو جائے۔ اس زمانے میں جگن بھیا دلی لائبریری میں کام کر رہے تھے

وہاں سے بلائے گئے اور بردکھوے کے لیے سفر پر روانہ ہوئے۔ لاکھ سر پر ٹیڑھی ترچھی ٹوپی رکھی اور استری شدہ شیروانی پہن کر جاذب نظر لگنے کی کوشش ہو لیکن ہزار ڈیڑھ ہزار کمانے والے کالج کے پرنسپل کے بیٹے ڈیڑھ سو روپیہ مہینے پانے والے اسسٹنٹ لائبریرین میں کشش نہ پیدا ہوسکی خالی ہاتھ ٹرخا دیے گئے۔ عورت کو آنچل سے پرچم بنانے کا پیام بھلا بہت تھا لیکن اس پیام پر عمل کرنا —— معاملہ خطرناک تھا۔ ایک طرف ہزاروں کمانے والا سرکاری عہدیدار۔ دوسری طرف دل شکستہ خالی جیب والا شاعر۔ زر کی جیت ہوئی۔ فن پھر شکست کھا گیا۔ شاعر نے ایک دفعہ دل کی آواز پر قدم اٹھائے تھے اور منہ کے بل گر گیا تھا۔ اس مرتبہ اس نے عقل پر بھروسہ کیا اور تھم تھم کر کے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنا ہاتھ بڑھایا پھر بھی ٹھوکر کھا گیا اور کھسیا کر رو پڑا۔ تدبیر کے پائے سنگین پر تقدیر نہ جھک سکی اور شاعر پر ۱۹۴۵ء میں دوسرا دیوانگی کا حملہ ہوا۔ اب وہ خود ہی اپنی عظمت کے راگ گاتا تھا۔ شاعروں کے نام کی فہرست تیار کرتا تھا اور غالب و اقبال کے نام کے بعد اپنا نام لکھ کر شجرہ ختم کر دیتا تھا۔ ڈاکٹروں کی کوشش اور جان توڑ تیمارداری اور دلجوئی سے کسی طرح قابو میں آ ہی گئے۔ لیکن زندگی کا ڈھرہ تو بدل نہ سکا۔ بیکاری اور تنہائی کا ساتھ رہا۔ شراب نوشی بڑھتی گئی زندگی میں تلخیاں بڑھتی گئیں اور وہ ان تلخیوں کو عرق مے ناب کرتے رہے۔ غرضکہ یہ سلسلہ جاری رہا اور اس جال میں جگن بھیا کی زندگی، وجود سب ہی کچھ الجھ کر رہ گیا۔ لوگوں نے کہا مجاز کا علاج شادی ہے پر یہ علاج ہوتا تو کیونکر۔ مجاز کی جیبیں خالی تھیں۔ جہاں بھی گھر والوں نے ہاتھ پھیلایا جواب ملا بڑے کے ساتھ تو نہیں البتہ چھوٹے کے ساتھ چاہو تو کر لو وہی مجاز جو کبھی اس میدان میں آرزوؤں کا مرکز تھا کوڑا کرکٹ بن کر رہ گیا۔ ہم لوگ چاہتے تھے کہ ان مایوسیوں کو جگن بھیا سے چھپائے رکھ سکیں لیکن انھیں اندازہ ہو ہی جاتا اور سوائے اس کے کہ ان کی مسکراہٹ میں تھوڑی سی تلخی اور گھل جاتی کسی طرح بھی ظاہر نہ ہوتا کہ وہ زمانہ کی ناقدری کے شاکی ہیں۔ ماں بہنوں کی ہمت نے جواب دیدیا کہ وہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ ایک طرف تو منہ توڑ جواب کا ڈر۔ دوسری طرف جگن بھیا کی رضامندی حاصل کرنے کا مسئلہ۔ کیونکہ تجربہ یہ ہو چکا تھا کہ جنسی بھوک خواہ کتنی شدید کیوں نہ رہی ہو۔ عورت کی

پرکھا ان میں ختم نہ ہوئی تھی (صرف دیوانگی کے عالم میں ایسا ہوا کہ یہ بھوک پوری طرح سے ان پر حادی اور یہ پرکھ ختم ہوئی) ماں کے ایک قریبی عزیز نے اپنی لڑکی کے لیے منظوری دے دی تھی نیت کا حال خدا جانتے۔ جا نے اماں کی مایوسی اور پریشان حالی سے متاثر ہو کر یا جگن بھیا کی بربادحالی پر رحم کھا کر۔ یا پھر انھیں سمجھ بوجھ کر اور ان کی قدر شناسی کے طور پر۔ بہر حال وہ راضی تھے۔ جگن بھیا سے پوچھا گیا۔ کافی عرصہ تک ٹالا کیے۔ اپنے دل کو ٹٹولتے رہے اور آخر کو ماں سے کہہ ہی دیا کہ ماں اس لڑکی میں کوئی کشش نہیں پاتا۔ اس کی قسمت پھوڑنے پر آپ کیوں تلی ہیں۔ یہ اپنی قسم کا ان کی زندگی میں دوسرا واقعہ تھا۔ ایک دفعہ علی گڈھ میں ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ ایک متمول آزاد خیال گھرانے کی نہایت تیز طرار لڑکی نے صفیہ آپا کے ذریعہ سے ان سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور اس کا جواب جگن بھیا نے یہ دیا تھا "صفیہ مجھے کاغذی پھولوں سے دلچسپی نہیں" نفس مضمون دونوں جوابوں کا ایک ہے۔ لیکن جن حالتوں میں دیے گئے ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان کا پہلا جواب اس وقت کا تھا جب وہ فلک شاعری پر ابھر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ترقی کا میدان دامن پھیلائے ہوئے تھا۔ امیدوں کے رنگ آمیز پرچم لہرا رہے تھے۔ اس لیے اس جواب کو تکبر اور خودسری کی دلیل سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کا دوسرا جواب اس وقت کا ہے جب وہ بالکل ٹوٹ چکے تھے در در سے ٹھکرائے جا چکے تھے جنسی تشنگی کا شکار تھے۔ لیکن اس حالت میں بھی عورت سے زیادہ عورت کا تصور انھیں عزیز رہا اس جواب میں ایثار ہے۔ شعور ہے۔ کردار کی بلندی ہے بہر حال جگن بھیا کو ایک ساتھی نہ مل سکا جو ان کے دل کی آواز کو سمجھ سکتا۔ ان کو سہارا دے سکتا جس کی ڈھارس سے وہ زندگی کی تھکن دور کر سکتے۔ انھیں رفاقت نصیب تھی تو وہ شراب کی۔ وہی ان کا واحد سہارا تھی اندھیری رات کے مسافر کی منزل خود فراموشی کے دھندلکے میں اوجھل سی ہو گئی۔ انکے چہرے کی تابانی پر دھیرے دھیرے بے بسی کا پردہ گہرا ہوتا گیا۔ آنکھوں کی دمک کی جگہ اتھاہ گہرائی نے لے لی۔ جس میں امیدیں آرزوئیں دفن ہوں۔ یاس و محرومی جھانک رہی ہو۔ کس غضب کی گہرائی تھی ان آنکھوں میں اور کیا کچھ پوشیدہ تھا ان میں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کا دل بجھ سا گیا ہو۔ جیسے انہیں

ابھرنے کی خواہش باقی ہی نہ ہو۔ غرضکہ سہم سکڑ کر بقول عصمت آپا کے وہ بالکل نکھٹو رہ گئے۔ نکھٹو بھی ایسا جو شرابی تھا اور شرابی بھی ایسا جسے پیتے وقت اسکا بھی ہوش نہ رہتا ہو کہ کتنی پی چکا ہے اور کیسی پی رہا ہے۔ میں نے اکثر چاہا کہ ان سے منت کروں التجا کروں کہ وہ اپنے کو سنبھالیں لیکن جب کبھی میں نے ارادہ کیا میری ہمت جواب دے گئی۔ آوارہ کا مصنف اتنا سخت دل نہیں ہو سکتا کہ ماں کے آنسوؤں سے نہ پگھل سکے جبکہ وقت ماں انھیں سمجھاتیں۔ زندگی کا اونچ نیچ سمجھاتیں۔ گھر کی بگڑی ہوئی حالت کا احساس دلاتیں اپنی محبت کا باپ کی عزت کا واسطہ دیتیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات بتاتے کہ ماں کے آنسوؤں کا ہر قطرہ ان کے دل پر نشتر کی طرح لگتا۔ پھر بھی نہ جانے وہ کس الجھاوے میں تھے جس سے اپنے کو نہ نکال پائے۔ غرضکہ وہی جگن بھیا جو ہماری امیدوں آرزوؤں کا مرکز تھے پریشانیوں اور الجھنوں کا مرکز بن کر رہ گئے کبھی ہم ان کی شراب نوشی اور خود فراموشی پر جھنجھلاتے۔ تلخ ہوتے۔ جی چاہتا کہ انھیں اتنا جھنجھوڑیں کہ ان کے ہاتھ سے "فریب بے خودی دیتے ہوئے بلور کے ساغر" جھنجھنا کر ٹوٹ جائیں اور وہ چونک کر پھر اپنی منزل کی طرف چل پڑیں۔ کبھی جی چاہتا کہ ان سے چمٹ کر اتنا روئیں کہ ہمارے آنسوان کے جمود کو بہالے جائیں اور وہ پھر یہ کہہ اٹھیں ؎

تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر

جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

ایسا لگتا ہے جیسے ان کا عدم وجود سب برابر ہو۔ جیسے وہ ہمارے درمیان ہوتے ہوئے بھی ہماری پہنچ سے باہر ہوں جیسے وہ بہت دور خلاؤں میں گم ہو رہے ہوں۔ پتہ ہی نہ چلا کہ انکے دل کی گہرائیوں میں کیا پوشیدہ ہے۔ چوٹیں کھاتے تھے اور خاموش رہتے تھے۔ پینتالیس سال کی عمر میں ایک دفعہ بھی تو ایسا نہ ہوا کہ انھوں نے ایک دفعہ بھی زندگی کی شکایت کی ہو یا کسی کا شکوہ کیا ہو۔ زندگی میں ایسا زبردست اعتماد اور اپنی زندگی سے اتنی بے نیازی۔ تلخیاں سہتے عمر بیتی اور مزاج میں ذرا تلخی نہ پیدا ہوئی۔ کبھی تو کسی بات پر جھنجھلا اٹھتے۔ بیزاری کا اظہار کرتے۔ سب کچھ خاموشی سے سہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۵۲ء میں تیسرا اور آخری نروس بریک ڈاؤن کا حملہ ہوا اور

اس غضب کا شدید کہ خدا کی پناہ گھر میں ٹکنا ہی گوارا نہ کیا۔ دلی کے گلی کوچوں کی خوب خوب خاک چھانی جنسی محرومی کے تماشے دلی والوں نے خوب خوب دیکھے۔ جس انسان نے عالم ہوش میں کبھی بھی کوئی چھچھوری اور رکیک حرکت نہ کی تھی وہ ہر لڑکی کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ گھر والے ہر لمحہ اس خبر کے منتظر تھے کہ مجاز موٹر سے کچل گیا۔ ٹھٹھرا ہوا سڑک پر پایا گیا۔ انجام یہی ہونا تھا لیکن کچھ دن ٹھہر کر۔ وہی ستر سالہ ماں جس نے بیٹے کے مستقبل کے نہ جانے کتنے سنہرے خواب دیکھے تھے۔ جا نماز پر بیٹھ بیٹھ کر دعائیں مانگتی تھی۔ یا الٰہی اسے اٹھالے یا مجھے۔ جو میں اس طرح کے تماشے نہ دیکھوں۔ دلی سے جوش صاحب کا خط آیا کہ مجاز کو آگرہ بھیج دیا جائے۔ مجاز اور آگرہ کا پاگل خانہ۔ دل پر کیسی چوٹ لگی لیکن مجاز پاگل تھا۔ اس حقیقت سے کیونکر انکار ہو سکتا تھا۔ پاگل کو آخر کہاں تک اور کیسے بھگتا جاتا۔ جوش صاحب کو میں نے خط لکھا کہ اپنے رسوخ استعمال کر کے رانچی میں جگہ دلوا دیں۔ جوش صاحب کو خط ملا یا نہیں۔ بہرحال میں جواب کے انتظار ہی میں رہی۔ ڈاکٹر ڈیوس، رانچی اسپتال کے انچارج سے براہ راست خط و کتابت کی جگن بھیا کی لائف ہسٹری لکھ کر بھیجی۔ شاید ان کی زندگی کے واقعات سے متاثر ہو کر اس نے بی کلاس وارڈ میں ایک بیڈ دے ہی دیا۔ ورنہ ایسے اسپتالوں میں بغیر سفارش کے جگہ کب ملتی ہے۔ مجاز کو بہ مشکل رانچی بھیجا گیا۔ بوڑھے باپ نے اپنی پونجی کی آخری کوڑی انھیں بچانے کے لیے لگا دی۔ اور چھ مہینے بعد وہ بچ کر آگئے ان کی واپسی کے ایک مہینے بعد صفیہ آپا کا انتقال ہوا اس صدمہ کا اثر ان پر بجلی کے شاک کا سا ہوا۔ جیسے یکدم چونک پڑے ہوں۔ ایک دفعہ پھر ان میں ذمہ داریوں کا احساس چمکا۔ جادو اوس کی پڑھائی و دیگر مشغلوں میں دلچسپی لینا ان کی دلجوئی کرنا زیادہ تر وقت گھر پر گذارنا۔ شراب سے قطعی پرہیز رات کو جی بھر کر سوتے۔ دن میں ہنستے کھیلتے۔ باتیں کرتے۔ گھنٹوں سب کے ساتھ تاش کھیلا کرتے۔ بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتے۔ تصویریں بنا بنا کر سب میں بانٹتے۔ چھوٹے بچوں کو ایک دوسرے سے لڑواتے۔ ایسا لگتا جیسے جادو اوس عشو عرفی کے بچپن میں میرا بچپن دہرا رہا ہو جگن بھیا پھر بیس پچیس سال پہلے والے جگن بھیا بن گئے ہوں لیکن بنیادیں تو ہلی نہ تھیں۔ زندگی کا یہ نیا ڈھانچا کیونکر کھڑا رہتا کاش اس وقت ان کا ہاتھ کسی نے

تھام لیا ہوتا۔ ان کے لیے کسی نے "سازِ بیداری" اٹھا لیا ہوتا۔ لیکن ایسا کیوں ہوتا۔ ان کی موت کو ان کی زندگی کا نقطۂ عروج بننا تھا۔ انھیں تو یہ دکھانا تھا کہ جیتے جی مرنا کسے کہتے ہیں۔ اور مر کر بھی کیسے جیا جا سکتا ہے غرضکہ چھ مہینے تک جگن بھیا بالکل نارمل رہے۔ چاہنے والے ساتھی اور سچے دوست اپنے اپنے کام دھندوں میں ادھر ادھر لگے ہوئے تھے ان کی ظرافت طبع اور بذلہ سنجی سے لطف اٹھانے والے ناسمجھ دوستوں اور ان کی شاعری کو کھلونا سمجھ کر دل بہلانے والے نادان ادب نوازوں نے انھیں پھر شراب خانہ کی طرف رجوع کرنا شروع کیا۔ وہاں قدم رکھنے کے بعد ان کے قدم تیزی سے اس طرف اٹھنے لگے۔ راتوں کو مدہوشی کے عالم میں دو تین بجے گھر واپس آنا۔ دن میں دس گیارہ بجے خمار کے عالم میں اٹھنا۔ منہ ہاتھ دھو کر برآمدے میں پڑے ہوئے پلنگ پر ناشتہ کرنا تھوڑی دیر اخبار کے ورق ادھر ادھر پلٹنا۔ یہ تھا ان کا پروگرام اس درمیان میں موقع پا کر ماں کوشش کرتیں کہ رات کی کیفیت کا انھیں احساس دلائیں اور آئندہ کے لیے احتیاط پر آمادہ کریں چپ چاپ سب کچھ سنا کرتے۔ ایک خاموشی ہر بات کا جواب تھی۔ جب اندرونی کشمکش برداشت سے باہر ہو جاتی تو اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیتے اور پھر سب بچوں کو یکجا کر کے ان کے ساتھ کھیل میں اپنے کو بھولنے کی کوشش کرتے۔ گھر میں ماشاء اللہ بچوں کی تعداد بہت طویل تھی۔ سات عدد بچے تھے دو صفیہ آپا کے۔ دو میرے اور تین میرے بھانجے کے۔ ان سب میں بھانجے کا تین سالہ بچہ عرفی انھیں عزیز تھا۔ اماں کہتی ہیں کہ اس کا بچپن بالکل جگن بھیا جیسا ہے بہت شریر اور بے خبر اس سے خود کو استاد کہلاتے اور کہتے کہ یہ میرا شاگرد ہے۔ اس کو اپنے پاس کھڑا کر لیتے تب کھانا کھاتے۔ وہ اپنی گندی گندی انگلیوں سے سالن کے پیالے کی بوٹی کی چھین جھپٹ کیا کرتا آخر کو آدھی آدھی پر معاملہ طے ہوتا۔ خود بھی بہت گندے طریقے پر کھانا کھاتے۔ چاول میں دال سالن ملا کر انگلیاں اس قدر تیزی سے چلاتے گویا کسی ساز پر چل رہی ہوں۔ یہاں تک کہ پلیٹ میں چھپ چھپ سا پیدا ہو جاتا تب منہ میں لقمہ لے جاتے۔ منہ ذرا کم کھلتا تھا اس لیے کھاتے وقت ہمیشہ ایک قسم کی سڑکنے کی سی آواز پیدا ہوتی تھی۔ سب بچے ان کو بجو دادا کہتے تھے۔ عالم ہوش میں بھی وہ ایک طرح کی

خود فراموشی ان پچوں میں کھو کر حاصل کر لیتے تھے۔ شام ہوتی۔ کپڑے بدلتے۔ کپڑوں کی صفائی اور نفاست کا لحاظ ہر عالم میں رہا۔ تیسرے دن ضرور کپڑے تبدیل کرتے تھے۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر ٹہلتے۔ ایسا لگتا کہ جیسے سوچ رہے ہوں کہ جاؤں کہ نہ جاؤں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہفتہ ہفتہ گھر سے نہ نکلتے۔ لیکن آخر ایسے کب تک گذر ہوتی۔ آخر کو چل ہی دیتے۔ شاید اس ارادے کے ساتھ کہ اب اپنے کو کھو کر واپس نہ آؤں گا۔ لیکن باہر جا کر انکی قوت ارادہ بالکل جواب دے جاتی اور پھر اسی بدحالی میں واپس آتے کبھی پیدل اور کبھی رکشا میں۔ کھانا۔ سگریٹ اور پان سمیت انکے کمرے میں رکھ دیا جاتا۔ یہ مدتوں پرانا معمول تھا۔ اگر کچھ ہوش میں ہوتے تو کھا لیتے ورنہ پھر صبح کھاتے غرض کہ دن کو بیکاری اور رات کو شراب نوشی کا زہر گھن کی طرح ان کی زندگی کو لگتا رہا۔ اور ہم سب یہ تماشہ دیکھتے رہے آخر ایک دن سب نے سن لیا کہ مجاز مر گیا۔ پتھروں پر سسک سسک کے ٹھنڈ میں ٹھٹھر کر یہ مجاز کی موت تھی۔ فنکار کی موت شاعر کی موت۔ کہانی پوری ہوئی۔ ڈرامہ ختم ہوا۔ پردہ گر گیا۔ پر ایسا کیوں ہوا۔ ایسا کیسے ہوا۔ یہ خلش یہ ٹھسک ہر حساس دل و دماغ میں باقی رہ گئی۔

مجازؔ

اسلوب احمد انصاری

نئی نسل کے اردو شاعروں میں مجاز کا نام خاصا جانا پہچانا ہے۔ ان کی شاعری پر کوئی مقررہ لیبل چسپاں کرنا آسان نہیں ہے، کیونکہ ایک طرف تکنیک کے معاملے میں وہ پرانی روش سے سرمو انحراف نہیں کرتے، اور انھوں نے جدید وضع کے تجربوں سے ہمیں روشناس نہیں کرایا۔ اور دوسری جانب ان کی بیشتر نظمیں مواد اور روح کے اعتبار سے انقلابی نہیں محض غنائی ہیں۔ ان کی مقبولیت کا راز انہی ہلکی پھلکی، خوشگوار اور تندرست رومانی نظموں میں ہے۔ ان کے مزاج کے عناصر ترکیبی میں جام و مینا، تیغ و سناں حسن و نغمہ، سب کی آمیزش ہے۔ لیکن ان کے مطبوعہ کلام کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ پتہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ ان کی شاعری کے خط و خال کی تشکیل ایک رچے اور نکھرے ہوئے رومانی نقطۂ نظر اور افتادِ طبیعت سے ہوئی ہے۔ ان کا کلام سرتاپا اسی شیفتگی و سرمستی جذب و کیف اور وخود رفتگی میں ڈوبا ہوا ہے جو ان کی شخصیت میں اس حد تک نمایاں ہے، اس میں ذرا شبہہ نہیں کہ انھوں نے نہ صرف ایسے موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں جن پر طبع آزمائی کرنا ترقی پسندی کی علامت ہے۔ بلکہ خالص رومانی نظموں میں بھی ماحول سے ناآسودگی کے جذبہ نے خود ساختہ پابندیوں کی قدم قدم پر شکست و ریخت کی ہے ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا، کیونکہ کوئی ادیب یا شاعر محض خلا میں زندگی بسر نہیں کرسکتا، اور نہ تخیل کے نادیدہ پروں پر اُڑ کر کسی مصنوعی بہشت میں زیادہ عرصہ تک سانس لے سکتا ہے۔ پھر بھی مجھے اپنی اس رائے کے اظہار میں پس و پیش نہیں کہ ہم عصری اجتماعی زندگی اور اس کے مسائل کا شعور و احساس نہ مجازؔ کے شعری ادراک کا کوئی قابلِ ذکر جزو ہے اور

نہ یہ شعور و احساس فکر اور نغمے میں تبدیل ہوا ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ انھوں نے اپنے مشاہدات اور مطالعہ کو وسعت دینے کی کبھی کوشش نہیں کی اور اپنی نغمگی کو اُس کاوشِ ذہنی سے مرصع و مزین ہونے کا موقع نہیں دیا، جو جذبات کو فکر میں تبدیل کرنے اور فکر کو خواب کی سی رومانیت اور جذبہ کی سی تازگی، طرفگی اور رعنائی بخشنے کے لیے ضروری ہے۔ پھر بھی مجاز کی مقبولیت ان کے اکثر ہم عصر شعرا کے مقابلہ میں قابلِ رشک ہے ممکن ہے اس لیے ہو کہ ان کے تجربات محدود ہونے کے باوجود ذاتی اور اصلی ہیں۔ اور اگر ایک طرف ان کے بیان میں صفائی، نفاست اور پرکاری ہے تو دوسری طرف اُن میں اُبلتے ہوئے پہاڑی چشمہ کا جوش و خروش اور بادۂ تند و تیز کی حرارت اور سرخوشی ہے۔

حسن کا احساس اور جسم انسانی کے مشاہدہ اور اس کی کیفیات کا بیان مجاز کی نظموں میں شروع ہی سے ملتا ہے۔ ان کے مشاہدہ میں تفصیل، تناسب اور مینا کاری برابر نمایاں رہی ہے اور گو حیات کی اس شاعری میں کوئی گہرائی نہیں، تاہم اس میں ایک خوش گوار قسم کی لذتیت ہے۔ جسے شاعر نے ستر پردوں میں چھپائے بغیر برجستگی اور ایک حد تک والہانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ رنگ و بو کی اس شاعری میں جان نہ صرف مشاہدہ کی صحت اور الفاظ کے مناسب انتخاب سے پڑتی ہے۔ بلکہ پیکر نگاری (IMAGERY) کے اس فن سے بھی جس پر شاعر کو پوری قدرت حاصل ہے۔ جذبہ کو موزونیت اور دل کشی کے ساتھ متشکل کر دینا ہر اچھے شاعر کا گراں قدر جوہر ہے۔ نادر تشبیہوں کی تلاش، جو ذہن میں تازگی اور نظر میں وسعت پیدا کرنے میں مدد ہوتی ہیں۔ مجاز کے شاعرانہ عمل کا ایک خاص وصف ہے چند مثالوں سے یہ بات ظاہر ہو جائے گی ؎

چمک تاروں کی چشمِ سرمگیں میں	جھلک چاندی کی جسمِ مرمریں پر
نشاطِ رنگ و بو سے چور آنکھیں	شرابِ ناب سے لبریز ساغر
وہ محرابیں سی سینوں پر نمایاں	فضائے نور میں کبوتر کے شہپر
نفس کی آمد و شد سے تلاطم	شبِ مہتاب میں جیسے سمندر

اللہ اللہ وہ پیشانیٔ سیمیں کا جمال — رہ گئی جم کے ستاروں کی نظر آج کی رات

عارضِ گرم پر وہ رنگِ شفق کی لہریں — وہ میری شوخ نگاہی کا اثر آج کی رات

نرگسِ ناز میں وہ نیند کا ہلکا سا خمار — وہ میرے نغمۂ شیریں کا اثر آج کی رات

سحر و اعجاز لیے جنبشِ مژگانِ دراز — خندۂ شوخ جمالِ دُرِ خوش آب لیے

ضوفگن روئے حسین پر شبِ مہتابِ شباب — چشمِ مخمور نشاطِ شبِ مہتاب لیے

نشۂ نازِ جوانی میں شرابور ادا — جسم ذوقِ گہر و اطلس و کمخواب لیے

زلفِ شب رنگ لیے صندل و عود و عنبر — خمِ ابروئے حسین دیر کی محراب لیے

لب گلرنگ و حسین، جسم گدازو سیمیں — شوخیٔ برق لیے لرزشِ سیماب لیے

یہ روپہلی چھاؤں، یہ آکاش پر تاروں کا جال — جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال

آہ لیکن کون جانے کون سمجھے جی کا حال — اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

مجاز نظم کے شاعر ہیں۔ وہ اپنے تجربات اور مشاہدات میں وہ ہمہ گیری، ارتکاز (CONCENTRATION) اور گہرائی نہیں پیدا کر سکتے، جو اچھے غزل گو شاعر کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بجز دو تین غزلوں کے ان کی بیشتر غزلیں پڑھنے والے کے ادراک میں کوئی تموج نہیں پیدا کرتیں۔ لیکن نظم کے لیے جس منطقی تسلسل پھیلاؤ اور جزئیات نگاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور خیال جس طرح لمحہ بہ لمحہ اور منزل بہ منزل نظم کی بساط پر محیط ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ ان کی نظموں میں ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ ابتدائی نظموں میں "رات اور ریل" جو اکثر خصوصیات کی بنا پر ایک معمولی بیانیہ نظم ہے۔ تخئیل کی اس ان تھک اور مستقل پرواز کا پتہ دیتی ہے جو آگے چل کر "آوارہ" "خواب سحر" اور "ایک غمگین یاد" جیسی نظموں میں ظاہر ہوئی۔ ترقی پسند خیالات کی نمائندگی جو نظمیں کرتی ہیں، ان میں دو نظمیں "نوجوان خاتون سے" اور "پردہ اور عصمت" اچھی ہیں۔

پہلی نظم کے چند اشعار یہ ہیں ؎

حجابِ فتنہ پرور اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا ۔۔۔ خود اپنے حُسن کو پردہ بنا لیتی تو اچھا تھا

دلِ مجروح کو مجروح کرنے سے کیا حاصل ۔۔۔ تو آنسو پونچھ کر اب مسکرا لیتی تو اچھا تھا

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن ۔۔۔ تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

لیکن مجاز کی بیشتر انقلابی نظمیں، اعلیٰ اور کامیاب شاعری کے معیار پر پوری نہیں اترتیں کیونکہ ان نظموں میں وہ شاعر کے منصب کا احترام کم کرتے ہیں۔ انقلاب کا ڈھنڈورا زیادہ پیٹتے ہیں۔ ان کی نظموں میں جگہ جگہ اس بغاوت کی آگ کے شعلے ملتے ہیں جن سے ہر نوجوان اور حساس شاعر کا دل آتشکدہ بنا ہوا ہے۔ یہ اضطراری ردِ عمل بھی اپنی جگہ قابلِ احترام ہے لیکن بغاوت کے شعلے کو تعمیری انقلاب کے نغمہ میں تبدیل کرنے کے لیے جس ریاض کی ضرورت ہوئی ہے۔ مجاز اس سے گذرنا نہیں چاہتے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرمایہ داری کے نظامِ کہنہ کے خلاف بیزاری اور نفرت تو ضرور محسوس کرتے ہیں، لیکن اپنے محسوسات کا تجزیہ نہیں کر سکتے اور اسی لیے کسی راستے کی طرف رہنمائی کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ ان تمام خامیوں کا سرچشمہ تفکر کا وہ فقدان ہے، جو ہمیں اُن کے یہاں تسلسل کے ساتھ ملتا ہے۔ "انقلاب" "اندھیری رات کا مسافر" "سرمایہ داری" "آہنگِ نو" ان سب نظموں میں وہی خامی کھٹکتی ہے، جس کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے۔ مجاز کا انقلاب کا تصور سراسر جذباتی ہے، جو صرف ایک بے معنی تخریب پر منتج ہوتا ہے۔ وہ نہ انقلاب کے اسباب و آثار اور اس کی قوتوں پر کوئی نظر رکھتے ہیں اور نہ ان کا شاعرانہ اندازِ فکر کسی سمت کی طرف کوئی اشارہ کرتا ہے۔ نظم "انقلاب" کے آخری حصہ میں انھوں نے لفظ "خون" کا بہیم استعمال کیا ہے "آوارہ" میں بھی جو اُن کی سب سے اچھی نظموں میں ہے اور جو اُن کی انفرادی روح کے کرب و غم اور متوسط طبقہ کی ذہنی، جذباتی اور معاشی غیر اطمینانی اور غیر آسودگی کی بہت صحیح ترجمانی کرتی ہے، یہ تخریبی میلان بہت نمایاں ہے۔ جن آخری بندوں کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، وہ پوری نظم کی ہیئت سے ایک گہرا، اندرونی، صناعانہ ارتباط ضرور رکھتے ہیں لیکن اگر ہم انھیں ان کے سیاق و سباق سے الگ کر کے ان کا رشتہ شاعر کے فکری نظام سے جوڑنے کی

کوشش کریں، تو ان کی اہمیت بہت ہی کم رہ جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری کو انقلاب کا جو تصور جوش نے دیا تھا اسے مجاز نے بغیر کسی تنقیدی محاکمے کے قبول کر لیا ہے اور چونکہ وہ طبعاً غور و فکر کے عادی نہیں ہیں اس لیے نہ اس کے حسن و قبح پر ان کی نظر پڑتی ہے، نہ اس میں وہ کوئی ترمیم و تنسیخ کر سکتے ہیں مجاز کے پورے کلام میں صرف دو مقامات ایسے نظر آتے ہیں، جہاں انھوں نے اس جذباتی ردعمل سے گریز کر کے چند ایسے اچھے اشعار کہے ہیں ؎

تقدیر کچھ ہو کاوش تدبیر بھی تو ہے — تخریب کے لباس میں تعمیر بھی تو ہے
ظلمات کے حجاب میں تنویر بھی تو ہے — آ منتظر ہے، عشرتِ فردا اِدھر بھی آ

"خوابِ سحر" میں مجاز کا لہجہ قدرے متوازن اور خیال انگیز ہو گیا ہے۔ اور اسی لیے اس نظم کے آخری اشعار سے بھی اُسی اجتماعی شعور کا اظہار ہوتا ہے جس کی ایک جھلک دیکھنے کی ہم اکثر نظموں میں بار بار کوشش کرتے ہیں لیکن جسے خطیب کے نطق کی کڑک بار بار ہماری نظروں سے اوجھل کر دیتی ہے ؎

اک نہ اک در پر جبینِ شوق گھستی ہی رہی — آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی
پُرمسلسل آفتیں، یہ یورشیں، یہ قتلِ عام — آدمی کب تک رہے اوہامِ باطل کا غلام
ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں — زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے — جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک اُدھر دیکھا تو ہے

مجاز کا مایۂ افتخار ان کی رومانی نظمیں ہیں ان کی خوبی اور دلکشی اس میں ہے کہ وہ ہمیں جذبات کی تنگنائے سے نکال کر ایک صحت مند لطیف اور دلنواز ترنم میں گم کر دیتی ہیں۔ ان میں فراوانی، اضطراب، انفرادیت مرکزیت سے گریز، جذباتیت، تخئیل کی شادابی اور بہاؤ غرض وہ تمام عناصر پائے جاتے ہیں جن سے رومانیت عبارت ہے۔ یہ نظمیں اصلی اور واقعی جذبات اور حالات سے تحریک اور نمو حاصل کرتی ہیں اور ان سے یہ پتہ چلتا ہے، کہ حسن و عشق کی واردات نے شاعر کے حساس اور بے چین دل کو ضرور متاثر کیا ہے لیکن مجاز کی بیشتر رومانی نظموں میں ایک خامی تو یہ ہے کہ شاعر کے تجربات بہت محدود ہیں۔ ان کی نظمیں "اعتراف" اور "تیانِ حرم" ان تجربات کی غمازی کرتی ہیں جو ان کی رومانی شاعری کا مرکزہ محور ہیں

اور حسن سے ان کا تانا بانا تیار ہوتا ہے۔ مگر انفرادی مسرت و غم کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتے تاوقتیکہ ان کے بہت ہی نادر اور معنی خیز پہلوؤں کو اُجاگر نہ کیا جائے اور ان میں عمومیت کا رنگ نہ بھرا جائے۔ ایسی نظمیں جو صرف محدود عشقیہ جذبات و معاملات کا سحر آفرین بیان ہوں، ایک خاص عمر اور ذہنی نشو و نما کے لوگوں ہی کے لیے اپنے اندر جذب و قبول کی طاقت رکھتی ہیں دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مجاز کی بیشتر نظمیں ایک منظم اور تربیت یافتہ تخئیل کی پرواز کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتیں۔ مجاز کے جذبات میں سرمستی اور سرشاری کی کمی نہیں ہے ــــ مگر ناپختہ جذبے کی بڑی اور دوامی شاعری میں کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ تاآنکہ وہ فکر کے معمول (MEDIUM) سے گذر کر ایک طرح کا توازن، پختگی اور ادراک پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت نہ پیدا کرے۔ مجاز کے پورے مجموعے میں سے صرف چند نظمیں یعنی "ایک غمگین یاد"، "شہر نگار"، "نادام"، "عیادت" اور دو تین غزلیں ایسی ہیں جن میں ہمیں جذبہ کی صداقت کے ساتھ ہی اس کی تہذیب و تکمیل کا بھی کسی حد تک احساس ہوتا ہے۔

آج پھر تا بہ چمن در پئے گلہائے چمن ـــ گنگناتا ہوا زنبورِ بہار آ ہی گیا
گیسوؤں والوں میں ابرو کے کمانداروں میں ـــ ایک صید آ ہی گیا ایک شکار آ ہی گیا
خیر مقدم کو مرے کوئی بہ ہنگام سحر ـــ اپنی آنکھوں میں لئے شب کا خمار آ ہی گیا

بیمار کے قریب بہ صد شانِ احتیاط ـــ دل داریٔ نسیم بہاراں لیے ہوئے
زلفوں کے پیچ و خم میں بہاریں چھپی ہوئی ـــ انگارِ روانِ نکہت بستاں لیے ہوئے
آ ہی گیا وہ میرا نگارِ نظر نواز ـــ ظلمت کدہ میں شمعِ فروزاں لیے ہوئے
ملتی ہوئی نگاہ میں بجلی بھری ہوئی ـــ کھلتے ہوئے لبوں میں گلستاں لیے ہوئے

اے شوقِ نظارہ کیا کہئے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصور کیا کیجے ہم صورتِ جاناں بھول گئے

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں، اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

ساقیٔ گلفام باصد اہتمام آ ہی گیا
نغمہ بر لب، خم بہ سر، بادہ بجام آ ہی گیا
میری دنیا جگمگا اٹھی کسی کے نور سے
میرے گردوں پر مرا ماہ تمام آ ہی گیا
پھر کسی کے سامنے چشم تمنا جھک گئی
شوق کی شوخی میں رنگ احترام آ ہی گیا

اثرؔ لکھنوی نے مجازؔ کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اردو شاعری میں ایک کیٹس پیدا ہوا تھا جسے انقلابی بھیڑیے اٹھا لے گئے۔ یہ رائے دو بہت ہی غلط مفروضوں پر مبنی ہے۔ مجازؔ کی شاعری ہلکی پھلکی، غنائی شاعری ہے۔ جس میں اس تفکر، اُس فلسفۂ جمال، اُس بصیرت کا، جو زندگی کے غموں کو انگیز کرنے اور گوارا بنانے سے پیدا ہوتی ہے، اور جو انگریزی رومانی شاعروں میں اس درجہ پائی جاتی ہے دور دور بھی نشان نہیں ملتا۔ رومانی شاعری سے قطعِ نظر، مجازؔ کی انقلابی شاعری بھی فکر و فہم کی جس کمی کا پتہ دیتی ہے، اس کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ دراصل اردو کے کسی رومانی شاعر کا کیٹس اور شیلے سے موازنہ کرنا فی الحقیقت اپنی علمیت کا مظاہرہ کرنا اور ناواقف لوگوں کو گمراہ کرنا ہے۔ ہمارے اردو شاعروں اور مغربی شاعروں میں مزاج و مذاق کا فرق بہت بین ہے پھر یہ بات بھی کچھ کم لحاظ کے قابل نہیں ہے کہ ہماری زندگی بھی اتنی رنگا رنگ، پیچیدہ، متنوع، نئی نئی ذہنی اور تمدنی تحریکوں کی دولت سے مالا مال اور ارتقاء کے امکانات کے لیے چشم براہ نہیں رہی ہے جتنی اہلِ مغرب کی زندگی، ہمارے شاعروں میں غالبؔ اور اقبالؔ کو چھوڑ کر کسی کے کلام میں بھی متضاد عناصر کی وہ کارفرمائی شمولیت (INCLUSIVENESS) کا وہ جوہر اور پیچ در پیچ تہذیب کا وہ عکس نہیں ملتا۔ جو انگریزی کے بیشتر ممتاز شعرا میں پایا جاتا ہے۔ جس سے میری مراد یہ ہے کہ ان شاعروں کے ذاتی مطالعہ، مشاہدات و تجربات اور ذہنی و جذباتی ردعمل کی ہم آہنگی کی بدولت ان کے کلام میں معنی و مفہوم کی جتنی تہیں ملتی ہیں

اور وہ ہمارے فکر و تخئیل کی سیرابی کے لیے جتنی وافر غذا فراہم کرتے ہیں۔ وہ ہمیں اردو شاعروں کے یہاں نہیں ملتی۔ تاہم یہ ماننے میں کسی کو بھی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ مجاز ہمارے ایک قابلِ قدر شاعر ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کی اٹھان سے ہمیں جتنی اُمیدیں وابستہ تھیں وہ سب کی سب پوری نہیں ہوئیں اور وہ اپنے تخئیل کی پرواز کو برقرار نہیں رکھ سکے۔ مگر کچھ تو اس لیے کہ ان کے کلام میں رچی ہوئی غنائیت کے بہت حسین نمونے ملتے ہیں اور کچھ اس لیے کہ انھوں نے اپنے محدود تجربات کو غنائیت میں ڈبو کر ہمارے لیے دل کش نغموں میں پیش کیا ہے جن میں کہیں کہیں ترقی پسند خیالات کی جھلک بھی ملتی ہے وہ نوجوان شعرا کے حلقے میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔
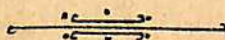
مجازؔ کی شاعری میں عورت کا تصور

خلیل الرحمٰن اعظمی

"طفلی کے خواب"، "اُن کا جشن سالگرہ"، "نذرِ علی گڑھ"، "شہر نگار"، "نوجوان خاتون سے"، "آوارہ" اور "خوابِ سحر" جیسی نظموں کا خالق اب اس دنیا میں نہیں لیکن اس کی یہ نظمیں ہمیشہ جوان رہیں گی۔ یہی ایک فقرہ مجازؔ کی شاعری پر جامع تبصرہ ہے۔ "برباد نگاران دل آرا"، اور "رسوائے مے و مینا" ہو کر بھی مجاز کے اندر کا انسان اپنی فطری معصومیت، بے پناہ خلوص، والہانہ سرشاری اور عنفوان شباب کی سرمستی و کجکلاہی کو آخر دم تک برقرار رکھ سکا اس کی مثال اس کے ہم عصروں میں شاید ہی مل سکے حیات جاوداں کی سعی ہر فن کار کا خواب طفلی ہے جس کی تعبیر کم خوش نصیبوں کے ہاتھ آتی ہے شابِ جاوداں صرف مجاز جیسے شہیدان محبت کے حصے میں آتا ہے۔

مجازؔ موجودہ دور کا محبوب ترین شاعر تھا۔ اپنے ساتھیوں میں شاید وہی اکیلا شاعر تھا۔ جس کی شاعری سے متعلق دو رائیں نہیں سُنی گئیں۔ اس کے کلام میں کچھ ایسی بے ساختگی، شادابی اور مہک ہے جسے قبول کر لینے میں کسی قسم کی جھجھک نہیں ہوتی۔ دوسروں کو ہم فکر و فن کی کسوٹی پر رکھتے ہیں، ان کا کھرا اور کھوٹا الگ کرتے ہیں، اس شاعری کی تہوں اور پیچیدگیوں کو کھولنے کی کوشش کرتے ہیں اور بار بار الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں لیکن مجاز کی آواز سنتے ہی نہ جانے کیوں گمان گزرتا ہے کہ یہ آواز کہیں اور سے نہیں آ رہی ہے بلکہ اپنے ہی سینے کے کسی گوشے سے اُٹھ رہی ہے۔ اپنی آواز اور اپنے ترنم کا نشہ تنقید کی گرفت میں ذرا مشکل سے آتا ہے۔

مجازؔ کے مجموعۂ کلام پر فیض احمد فیض کا مختصر دیباچہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے

ان کی صحت مندرومانیت، شفاف عنائیت اور جلال وجمال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس کے بعض گوشوں کو ابھی اور اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ میں اپنی اس مختصر تحریر میں مجازؔ کے کلام کی صرف ایک خصوصیت کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ ہے مجازؔ کے یہاں عورت کا تصور اقبالؔ کو ہندوستان کے شاعروں سے یہ شکایت تھی کہ بے چاروں کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ لیکن اس شکایت کی روشنی میں میں نے اُردو شاعری کے سرمایے پر غور کیا ہے تو میرا ردعمل کچھ مختلف رہا ہے۔ اُردو میں معدودے چند شعراء کے یہاں عورت کے خدوخال نمایاں ہوئے ہیں۔ وہ عورت جو شاہکار فطرت بھی ہے اور تخلیق کا سرچشمہ بھی اور جو خود اقبالؔ کے خیال کے مطابق افلاطون جیسے مفکر کے مکالمات کے لیے اپنی خاک سے شرارے فراہم کر سکتی ہے۔ ہمارے یہاں بقول رشید احمد صدیقی چاہے کچھ اور نہ ہوا ہو شاعری اور عاشقی اس دھوم دھام سے ہوئی ہے کہ خدا کی پناہ لیکن اس شاعری میں نہ جانے عجمی اثرات کے سبب یا اور کسی وجہ سے تصوف اور عشق دونوں محض ایک خلش کے مظہر بن کر رہ گئے ہیں جو بقول اصغر گونڈوی "رگ رگ میں دوڑی پھرتی ہے نشتر لیے ہوئے" اور حسن چاہے حقیقی ہو یا مجازی اکثر و بیشتر اپنی مجرد شکل میں آیا ہے۔

کہہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے　　مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

یا "دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا" پر ہی ہمارے شاعروں نے اکتفا کر لیا ہے جب کبھی اردو کے شاعر نے حسن مجرد کے دھندلکوں سے نکلنے کی کوشش کی ہے وہ ایک "کارٹونسٹ" کے منصب سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔ ایسی صورت میں بدر منیر، گل بکاؤلی یا زہر عشق کی مہ جبیں ہی اپنے پورے جسم کے ساتھ اردو شاعری کے اس خلا کو پُر کرتی ہیں یا پھر شریف النفس اور درد مند حالی کی مناجات بیوہ اور چپ کی داد میں ہم ان کے کچھ اور روپ دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے سوا اور کس شاعر کو جیتی جاگتی عورت سے سابقہ رہا ہے مجھے نہیں معلوم۔ اس محرومی کے سبب تو اہل لکھنؤ کو خود اپنے وجود کے اندر ایک عورت کو فرض کر لینا پڑا اور اس کے جو نتائج ریختی کی شکل میں ظاہر پذیر ہوئے وہ سب کو معلوم ہیں۔

اس سے پہلے کہ میں مجاز کے کلام سے عورت کے خدوخال کی نشان دہی کروں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ مجاز سے پیشتر اختر شیرانی کے یہاں اس عورت کی جلوہ گری ملتی ہے۔ گو کہ اختر شیرانی کی سلمیٰ ان کے تخئیل کی پروردہ اور خود ان کی زبان میں ایک "اسمانی خواب" ہے مگر اس خواب کو ئرائش کر ایک جسم عطا کرنا بھی اختر کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ یہ جسم کبھی کبھی عذرا اور ریحانہ کے نام بھی اختیار کرلیتا ہے۔ مجاز کے یہاں جمالیاتی عناصر کی کارفرمائی اختر ہی کے اثر سے پہلے آئی جس کا تذکرہ خود مجاز نے مجھ سے ایک بار کیا تھا۔ "نمائش میں" (۱۹۳۱ء) ان کی ایک ابتدائی نظم ہے جو انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ کی نمائش سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ اس نظم میں عورت کے جو مختلف روپ ہیں ان میں سے ایک پر اختر کی سلمیٰ کا پرتو بھی ہے۔ یہ نظم مجاز نے رومان میں چھپنے کے لیے بھیجی تھی اور یہی نظم دونوں کے تعلقات اور دوستی کی بنیاد بن گئی۔ سلمیٰ کے ذکر کے علاوہ اس نظم پر اختر شیروانی کے رومانی انداز نظر اور تصوریت کی چھاپ بھی نمایاں ہے۔

کوئی آئینہ دار حسنِ فارس	کسی میں حسن یونانی کے جوہر
کسی میں عکس معصوم کلیسا	کسی پر پرتوِ اصنام آذر
یہ شیریں ہے، وہ تو شاید ہے شاید	نہیں یاں فرق فرہاد و سکندر
یہ اپنے حسن میں عذرائے وامق	وہ اپنے ناز میں سلمائے اختر
یہ تابانی میں خورشید درخشاں	وہ رعنائی میں اس سے بھی فزوں تر
ہنسی اس کی طلوع صبح خنداں	نوا اس کی سرودِ کیف آور
یہ شعلہ آفریں وہ برق افگن	یہ آئینہ جبیں، وہ ماہ پیکر

پوری نظم اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ ابھی شاعر کے یہاں یہ زندہ مناظر دور کے جلوے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسری طرف یہ "ماہ پیکر" بھی ابھی ان شفاف آئینوں کی طرح ہیں جہاں کسی کا عکس نہیں ٹھہر سکتا۔

وہ جنبش سی ہوئی کچھ آنچلوں میں — وہ لہریں سی اٹھیں کچھ ساریوں پر
خرام ناز سے نغمے جگاتی — وہ چل دیں ایک جانب مسکرا کر
کسی کی حسرتیں پامال کرتی — کسی کی حسرتیں ہمراہ لے کر
کبھی آنکھیں دکانوں پر جمی ہیں — کبھی خود اپنی ہی برنائیوں پر
ادھر ہم نے اک آہِ سرد کھینچی — ہنسی پھر آگئی اپنے کیے پر

آخری مصرع خاص طور پر عنوان شباب کی منزلوں سے گزرتے ہوئے ایک الھڑ نوجوان کی نفسیات کا ترجمان ہے، جو ابھی معصوم بچوں کی طرح رنگین تتلیوں کے پیچھے دوڑتا ہے اور جب ہاتھ نہیں آتیں تو ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ یہ اس مجاز کی تصویر ہے جو ابھی اس خلش اور محرومی سے دوچار نہیں ہوا تھا جس نے بعد میں چل کر اس کی زندگی کو ایک مسلسل شکست اور روح کو کچو کے دینے والا عذاب بنا کر رکھ دیا۔

"ان کا جشن سالگرہ" (۱۹۳۵ء) میں پہلی بار ہمیں اس عورت کا نشان ملتا ہے جو نمائش کی "دوشیزگانِ ناز پرور" کی طرح بے نیاز اور الھڑ ہونے کے بجائے دوشیزگی کی خلش اور خواب سے آشنا ہے۔ ابھی اس کے جذبات کو زبان نہیں مل سکی ہے لیکن حیا کے بوجھ سے جھکی ہوئی آنکھیں بول رہی ہیں۔ اس موقع پر شاعر کے لیے سرسری گزر جانا ممکن نہ تھا۔ اس پیکر کے آگے اسے جھکنا ہی پڑا اور اس کی وفا آگے بڑھ کر قدم چومنے کے لیے مجبور ہوگئی۔ یہ تصویر مجاز نے بڑی دلکش اور سحر آفریں بنائی ہے۔ سنگ مرمر کا یہ مجسمہ اپنے منہ میں زبان بھی رکھتا ہے اور اس کی سانسوں کی مہک ہمارے جسم تک پہنچ جاتی ہے۔

اک مجمعِ رنگیں میں وہ گھبرائی ہوئی سی
بیٹھی ہے عجب ناز سے شرمائی ہوئی سی
آنکھوں میں حیا لب پہ ہنسی آئی ہوئی سی

ہر سانس میں احساس فراواں کی کہانی
خاموشیٔ محجوب میں اک سیل معانی
جذبات کے طوفان میں ہے دوشیزہ جوانی

فطرت نئے جذبات کے در کھول رہی ہے
میزان جوانی میں اسے تول رہی ہے
لب ساکت و صامت ہیں نظر بول رہی ہے

اے تو کہ ترے دم سے مری زمزمہ خوانی
ہو تجھ کو مبارک یہ تیری نور جہانی
افکار سے محفوظ رہے تیری جوانی

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زور شباب اور زیادہ

جس کردار کے لیے یہ دعائیں مانگی گئی تھیں (اور ان دعاؤں کے پردے میں خود اپنے ارمانوں کی کلی کے کھلنے کی تمنا بھی تھی) اس سے "نذر دل" (۱۹۳۶ء) میں عہد و پیمان ہوتے ہیں -

کون تم سے چھین سکتا ہے مجھے کیا وہم ہے — خود زلیخا سے بھی تو دامن بچا سکتا ہوں میں
دل میں تم پیدا کرو پہلے مری سی جرأتیں — اور پھر دیکھو کہ تم کو کیا بنا سکتا ہوں میں
تم سمجھتی ہو کہ ہیں پردے بہت سے درمیاں — میں یہ کہتا ہوں کہ ہر پردہ اٹھا سکتا ہوں میں

لیکن یہ پردے اتنے مضبوط تھے کہ آغاز محبت کی ایک ترنگ انھیں اٹھانے سے قاصر تھی،

یہ احساس "مجبوریاں" (۱۹۳۶ء) میں شاعر پر بڑی طرح مسلط ہوجاتا ہے۔ اگرچہ اس کی محبت یک طرف نہیں بلکہ خلوص کی یہ آگ دونوں طرف جل رہی ہے اور اس خلوص نے اسے محبت کا ایک پاکیزہ تصور دیا ہے جو مروجہ نظام اخلاق کی کسوٹی پر بھی پورا اتر سکتا ہے۔

زبان پر بیخودی میں نام اس کا آہی جاتا ہے — اگر پوچھے کوئی یہ کون ہے بتلا نہیں سکتا
ہوس کاری ہے جرم خودکشی میری شریعت میں — یہ حدِّ آخری ہے میں یہاں تک جا نہیں سکتا

لیکن معاشرت کے قوانین اپنے اندر اس خلوص کے لیے کبھی گنجائش نہیں نکالتے اور اس فاصلے کا احساس شدید سے شدید تر ہوجاتا ہے۔

وہ مجھ کو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی — میں اس کو پوجتا ہوں اور اس کو پا نہیں سکتا
یہ مجبوری سی مجبوری، یہ لاچاری سی لاچاری — کہ اس کے گیت بھی جی کھول کر میں گا نہیں سکتا
حدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے — کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہنچا نہیں سکتا

یہی "حدیں" مجاز کے المیے کا آغاز کرتی ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ مجاز کی رومانی زندگی کو سب سے پہلے جس معاشرت سے دوچار ہونا پڑا وہ علی گڑھ کی معاشرت ہے۔ علی گڑھ کے پس منظر کے بغیر مجاز کی نظموں کے محرکات کو سمجھنا آسان نہیں۔ علی گڑھ ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے بڑی دانشگاہ ہونے کے علاوہ نئی تہذیب کا سب سے بڑا منبع تھا۔ مغرب سے آئی ہوئی نئی ہواؤں کا خیر مقدم سب سے پہلے اسی سرزمین پر ہوا۔ نئی تہذیب کے اثر سے تعلیم نسواں اور پردے کے پرانے تصورات میں بھی تبدیلیاں ہونے لگیں۔ خان بہادر شیخ عبداللہ کی مساعی سے جب یہاں ویمنس کالج کی بنیاد پڑی اور ان کی لڑکیوں نے سب سے پہلے پردہ ترک کیا تو قدامت پسند طبقے میں ایک ہلچل سی مچ گئی جس کے نشانات اکبر الہ آبادی کے کلام میں ملتے ہیں۔

پردے کا مخالف جو سُنا بول اٹھیں بیگم — اللہ کی مار اس پہ علی گڑھ کے حوالے۔

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی — اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

اس زمانے میں اقبال نے بھی اکبر کی اس آواز پر لبیک کہا تھا۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی — قوم نے ڈھونڈھ لی فلاح کی راہ

یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین — پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

اقبال کے یہاں اکبر کا یہ زاویۂ نظر اور اندازِ بیان کی مماثلت ہی تھی جس کی بنا پر ان کے اس نوع کے کلام کو خواجہ حسن نظامی نے ایک زمانے میں "اکبری اقبال" کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ اقبال زندگی کے دوسرے حقائق میں آگے چل کر اکبر سے علیحدہ مسلک اختیار کرتے ہیں لیکن عورت کے بارے میں ان کا رویہ کم و بیش آخر تک وہی رہا۔ گو علی گڈھ نئی تعلیم اور نئی تہذیب کی برکتوں سے بہرہ ور ہوتے ہوئے بھی قدیم اخلاقی اقدار اور شرافت کے پرانے معیاروں سے پورے طور پر دامن نہیں چھڑا سکا تھا۔ مگر اس "نیم پردے" کے ماحول نے علی گڈھ کے نوجوانوں کی نفسیات پر خاطر خواہ اثر کیا۔ عورت کی آزادی اور اسے مردوں کے دوش بدوش لاکھڑا کرنے یا قومی تحریکوں میں اس کی شمولیت۔ یہ رجحان تحریکِ خلافت اور اس زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کی ترکی سے دلچسپی کی وجہ سے بروئے کار آیا اور جب یہیں کے ایک فرزند سجاد حیدرؔ نے ترکی جاکر وہاں کی زبان سیکھی، یلدرم تخلص اختیار کیا اور ترکی ادب کے جواہر پاروں کو اردو میں منتقل کرنا شروع کیا تو اس رجحان کو اور تقویت ملی۔ ۱۹۳۳ء۔ میں جب علی گڑھ کی دعوت پر خالدہ ادیب خانم تشریف لائیں اور یلدرم کی صدارت میں یونین کے جلسے میں ان کا خیر مقدم کیا گیا تو اس موقع پر مجازؔ نے اپنی نظم خالدہ پڑھی اور اس جاں باز خاتون کی تصویر کو اپنی خیالی دلھن کے لئے ایک

ـــ مجاز کے ذہنی نشوونما میں بالخصوص عورتوں کی آزادی سے متعلق ان کے زاویۂ نگاہ پر ڈاکٹر انصاری مرحوم سے عقیدت کا اثر بھی پڑا ہے جن کی رہنمائی میں ترکوں کی امداد کے لیے ایک وفد گیا تھا۔ مجاز کی نظم مزارِ رہنما (۱۹۳۹ء) اس عقیدت کی نشان دہی کرتی ہے۔

مثالی نمونہ بنا لیا۔

خالدہ تو ہے بہشت ترکمانی کی بہار　　تیری پیشانی پہ نورِ حریت آئینہ کار
تیرے رخ سے پرتوِ معصوم مریم آشکار　　تیرے جلووں کی صباحت سے فرشتے شرمسار

اے مقدس حور، اے پروردۂ موج نسیم　　روح عشرت گاہ ساحل، جانِ طوفانِ عظیم
تو نے ترکوں کو دکھائی ہے صراط مستقیم　　پھونک ڈالے ہیں تعصب کے حجابات قدیم

چنانچہ اپنی محبت کو پروان نہ چڑھتے دیکھ کر مجاز نے نوجوان خاتون (۱۹۳۷ء) کو بھی کس بَل اور شعور کی یہی روشنی پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے　　تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا
اگر خلوت میں تو نے سر اٹھایا بھی تو کیا حاصل　　بھری محفل میں آ کر سر جھکا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے کا ٹیکا مرد کی قسمت کا تارہ ہے　　اگر تو سازِ بیداری اٹھا لیتی تو اچھا تھا
اثر باقی نہیں مفلوج پیروں کی دعاؤں میں　　جوانانِ بلاکش کی دعا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن　　تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

آنچل کو پرچم بنانے کا مطالبہ ایک رومانی طریقۂ اظہار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ نوجوان عورت اپنے نسائی وجود کو ختم کر کے اپنے آپ کو مردانہ صفات میں ضم کر دے بلکہ مجاز اس عورت میں اس شعور کی کارفرمائی دیکھنا چاہتا ہے جس کی بدولت وہ اس قابل ہو جائے کہ "نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد" کا طعنہ اسے نہ سننا پڑے۔ پردہ اور عصمت (۱۹۳۷ء) میں وہ خالدہ کے ساتھ سنجوگتا، جون آف آرک اور طاہرہ قرۃ العین کا نام بھی لیتا ہے اور علی گڑھ کی اس عورت کو جو اس وقت مسلم معاشرت کی سب سے ترقی یافتہ عورت تھی ایک قدم اور آگے بڑھنے کے لیے کہتا ہے۔ اس زمانے کے علی گڑھ کے نوجوان کی روح اور اس کا دلکش رومانی کردار "نذر علی گڑھ" (۱۹۳۶ء) میں بڑے خوبصورت انداز میں آیا ہے

یہ دشتِ جنوں دیوانوں کا، یہ بزمِ وفا پروانوں کی
یہ شہرِ طرب رومانوں کا یہ خلدِ بریں ارمانوں کی

فطرت نے سکھائی ہے ہم کو افتاد یہاں پرواز یہاں
گائے ہیں وفا کے گیت یہاں چھیڑا ہے جنوں کا ساز یہاں

اس فرش سے اڑ اڑ کر ہم نے افلاک کے تارے توڑے ہیں
ناہید سے کی ہے سرگوشی، پروین سے رشتے جوڑے ہیں

اس بزم میں تیغیں کھینچی ہیں اس بزم میں ساغر توڑے ہیں
اس بزم میں آنکھ بچھائی ہے اس بزم میں دل تک جوڑے ہیں

یاں ہم نے کمندیں ڈالی ہیں یاں ہم نے شبخوں مارے ہیں
یاں ہم نے قبائیں نوچی ہیں یاں ہم نے تاج اتارے ہیں

یہ توانا اور شباب سے بھرپور مجاز جس عورت سے محبت کرتا ہے وہ بیباک اور سرکش ہوتے ہوئے بھی نسائی دل کشی اور مریمی شان رکھتی ہے، حیا اور پاکیزگی اس کے اصلی جوہر ہیں - یہ عورت ان "بے پردہ بیبیوں" سے مختلف ہے جنھیں دیکھ کر اکبر الہ آبادی غیرتِ قومی سے زمین میں گڑ گئے تھے۔ اس عورت کا سراپا اور اس کی مکمل شخصیت مجاز کی نظم "کس سے محبت ہے" (۱۹۳۹) میں ملتی ہے۔

جبیں پر سایۂ گستر پرتوِ قندیل رہبانی
عذارِ نرم و نازک پر شفق کی رنگ افشانی
قدم پر لوٹتی ہے عظمتِ تاجِ سلیمانی
ازل سے معتقد ہے محفلِ نورانیاں اس کی

لبِ لعلیں پہ لاکھا ہے نہ رخساروں پہ غازہ ہے
جبینِ نور افشاں پر نہ جھومر ہے نہ ٹیکا ہے

جوانی ہے سہاگ اس کا تبسم اس کا گہنا ہے
نہیں آلودۂ ظلمت سحر داماںیاں اس کی

زباں پر ہیں ابھی تک عصمت و تقدیس کے نغمے
وہ بڑھ جاتی ہے اس دنیا سے اکثر اس قدر آگے
مری تخئیل کے بازو بھی اس کو چھو نہیں سکتے
مجھے حیران کر دیتی ہیں نکتہ دانیاں اس کی

وہ میری جراتوں پر بے نیازی کی سزا دینا
ہوس کی ظلمتوں پر ناز کی بجلی گرا دینا
نگاہِ شوق کی بیباکیوں پر مسکرا دینا
جنوں کو درس تمکیں دے گئیں نادانیاں اس کی

مجازؔ کی یہ عورت باعصمت، بے داغ اور پر جلال شخصیت کے باوجود محبت کے فطری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے اس کے دل میں چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو اور اس کی سرشت میں آئین وفا کی نگہداشت ہے۔

وفا خود کی ہے اور میری وفا کو آزمایا ہے
مجھے چاہا ہے مجھ کو اپنی آنکھوں میں بٹھایا ہے
مرا ہر شعر تنہائی میں اس نے گنگنایا ہے
سُنی ہیں میں نے اکثر چھپ کے نغمہ خوانیاں اس کی

مرے چہرے پہ جب بھی فکر کے آثار پائے ہیں
مجھے تسکین دی ہے میرے اندیشے مٹائے ہیں
مرے شانے پہ سر تک رکھ دیا ہے گیت گائے ہیں
مری دنیا بدل دیتی ہیں خوش الحانیاں اس کی

کوئی میرے سوا اس کا نشاں پا ہی نہیں سکتا
کوئی اس بارگاہ ناز تک جا ہی نہیں سکتا
کوئی اس کے جنوں کا زمزمہ گا ہی نہیں سکتا
جھلکتی ہیں مرے اشعار میں جولانیاں اس کی

مجازؔ نے جس عورت کی محبت میں عنفوان شباب کے حوصلوں سے معمور والہانہ سرشاری کے گیت گائے تھے وہ عورت اپنی سرکشی اور صحت مند بغاوت کے باوجود سماجی جدوجہد میں مجازؔ کے ساتھ بہت دور نہ جاسکی۔ مجازؔ کی شکست پیہم کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے وہ سماج کے فرسودہ قوانین اور عصمت و عفت کے بے جان تصورات کے آگے تو سر نہ جھکا سکا۔ لیکن صنف لطیف کو اس کا جائزہ حق دالانے کی جدوجہد میں ہار گیا۔ اس کی وجہ اس کے حوصلے کی کمزوری نہیں بلکہ عورت کی یہ "نامکمل شخصیت" ہے پھر بھی اس نے اس "نامکمل عورت" کو بے وفائی کا الزام نہیں دیا۔ اس نے "اے عورت تیرا نام کمزوری ہے" کہنے کے بجائے اس کمزوری کی ذمہ داری سماج کے فرسود نظام پر رکھی۔

مجھے شکوہ نہیں دنیا کی ان زہرہ جبینوں سے
ہوئی جن سے نہ میرے شوق رسوا کی پذیرائی
مجھے شکوہ نہیں تہذیب کے ان پاسبانوں سے
نہ لینے دی جنھوں نے فطرت شاعر کو انگڑائی
زمانے کے نظام زنگ آلودہ سے شکوہ ہے
قوانین کہن آئیں فرسودہ سے شکوہ ہے

چنانچہ نظامِ زنگ آلودہ سے لڑنے کے لیے اسے بزم ناز سے ہجرت کے لیے سوچنا پڑتا ہے۔

ابھی تو حسن کے پیروں پہ ہے جبر حنا بندی
ابھی ہے عشق پر آئین فرسودہ کی پابندی

ابھی جاری ہے عقل و روح پر جھوٹی خداوندی
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

ابھی تو کائنات ادہام کا اک کارخانہ ہے
ابھی دھوکا حقیقت ہے، حقیقت اک فسانہ ہے
ابھی تو زندگی کو زندگی کر کے دکھانا ہے
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

زندگی کو زندگی کر دکھانے کی یہ لگن مجاز کو نہ جانے کن کن خار زار وادیوں میں لے گئی۔ یہی سفر مجاز کی بہترین نظموں کا محرک ہے۔ اندھیری رات کا مسافر، مہمان، دلی سے واپسی، آوارہ خواب سحر اور عشرت تنہائی سے لیکر آہنگ نو اور بول اری او دھرتی بول تک ساری نظمیں اسی جدو جہد کی داستان ہیں۔ اس جدو جہد میں مجاز پر کرب، انتشار و آوارگی اور جنون کی منزلیں آئیں لیکن کسی مقام پر اس نے سپر نہیں ڈالی وہ اس راہ میں لڑتے لڑتے شہید ہو گیا لیکن آخر وقت تک یہی کہتا رہا کہ۔

بہ ایں سیل غم و سیل حوادث مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

مجاز اپنی ناتمام محبت کے اس کردار کو بہت دونوں تک نہ بھلا سکا۔ وہ عورت جو اسے بیچ منجدھار میں اکیلا چھوڑ کر اپنی بارگاہ ناز میں واپس چلی گئی اس کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کرنے کے بجائے اس نے اس کی محبت اور مہربانیوں ہی کو یاد رکھا۔ فراق کا ایک شعر ہے۔

تو یاد آئے ترے جور و ستم پھر بھی نہ یاد آئیں
تصور میں یہ معصومی بڑی مشکل سے آتی ہے

اس معصومی کے فقدان نے اُردو کے اکثر شاعروں کی عشقیہ شاعری کو محبوب کی بے وفائیوں کی فہرست بنا کر رکھ دیا ہے مجاز کی شخصیت اس معصومی کا بکل مظہر ہے وہ اپنی پہلی اور

آخری محبت کی اس متاعِ عزیز کو کھونا نہیں چاہتا۔ یہ غمگین یاد (۱۹۴۱ء) اس کو اپنی طویل جدوجہد میں ایک سایہ دار درخت کی طرح پناہ دیتی ہے۔

مرے پہلو بہ پہلو جب وہ چلتی تھی گلستاں میں
فرازِ آسماں پر کہکشاں حسرت سے تکتی تھی
محبت جب چمک اٹھتی تھی اس کی چشمِ خنداں میں
خمستانِ فلک سے نور کی صہبا چھلکتی تھی

مرے بازو پہ جب وہ زلفِ شبگوں کھول دیتی تھی
زمانہ نکہتِ خلدِ بریں میں ڈوب جاتا تھا
مرے شانے پہ جب سر رکھ کے ٹھنڈی سانس لیتی تھی
مری دنیا میں سوز و ساز کا طوفاں آتا تھا

وہ میرا شعر جب میری ہی لے میں گنگناتی تھی
مناظر جھومتے تھے بام و در کو وجد آتا تھا
مری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جب مسکراتی تھی
مرے ظلمت کدے کا ذرہ ذرہ جگمگاتا تھا

اُمنڈ آتے تھے جب اشکِ محبت اس کی پلکوں تک
ٹپکتی تھی درودیوار سے شوخی تبسم کی
جب اس کے ہونٹ آجاتے تھے ازخود میرے ہونٹوں تک
جھپک جاتی تھیں آنکھیں آسماں پر ماہ و انجم کی

وہ جب ہنگامِ رخصت دیکھتی تھی مجھ کو مڑ مڑ کر
تو خود فطرت کے دل میں محشرِ جذبات ہوتا تھا
وہ محوِ خواب جب ہوتی تھی اپنے نرم بستر پر
تو اس کے سر پہ مریم کا مقدس ہاتھ ہوتا تھا

جشنِ سالگرہ سے لے کر ایک غمگین یاد تک جو مکمل عورت مجاز کی محبت اور پرستش کا محور رہی ہے اور جسے کھونے کے غم میں مجاز نے اپنی شخصیت کو لٹا ڈالا وہ ایک بار پھر نمودار ہوتی ہے لیکن اس وقت جب پانی سر سے گزر چکا تھا اور زندگی کے نشے سے چور رہنے والا مجاز محض ایک خاک کا ڈھیر ہو کر رہ گیا تھا۔ مومن کا یہ شعر

وہ آئے ہیں پشیمان لاش پر اب — تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

ممکن ہے محض تخئیل کی پیداوار ہو لیکن مجاز کی نظم "اعتراف" (۱۹۴۵ء) اس کیفیت کا ایسا کرب انگیز اظہار ہے جس کی شدت اور بے پناہ تاثیر ہماری شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو
میں نے مانا کہ تم اک پیکرِ رعنائی ہو
چمنِ دہر میں روحِ چمن آرائی ہو
طلعتِ مہر ہو فردوس کی برنائی ہو
بنتِ مہتاب ہو گردوں سے اُتر آئی ہو
مجھ سے ملنے میں اب اندیشۂ رسوائی ہے
میں نے اب اپنے کیے کی یہ سزا پائی ہے

کیا سنو گی مری مجروح جوانی کی پکار
میری فریادِ جگر دوز مرا نالۂ زار

شدت کرب میں ڈوبی ہوئی میری گفتار

میں کہ خود اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار

وہ گداز دل مرحوم کہاں سے لاؤں

اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں

میرے سائے سے ڈرو، تم مری قربت سے ڈرو

اپنی جرأت کی قسم اب مری جرأت سے ڈرو

تم لطافت ہو اگر میری لطافت سے ڈرو

میرے وعدوں سے ڈرو، میری محبت سے ڈرو

اب میں الطاف و عنایت کا سزاوار نہیں

میں وفادار نہیں، ہاں میں وفادار نہیں

"میں وفادار نہیں، ہاں میں وفادار نہیں" کہتے ہوئے مجازؔ کے دل پر کیا کچھ بیت گئی ہوگی اس کی تفسیر ممکن نہیں۔

مجازؔ کے المیہ کی اس ہیروئین کے علاوہ اس کے کلام میں بعض دوسری عورتوں کے کردار بھی آتے ہیں۔ نورا (۱۹۳۶ء)، ننھی پجارن (۱۹۳۶ء)، عیادت (۱۹۴۴ء) اور مادام (۱۹۴۴ء) میں ہمیں عورت کی شخصیت اور اس کے کردار کے بعض دوسرے دلنواز و دلفریب پہلو ملتے ہیں جس سے مجازؔ کے شاعرانہ مزاج نے نکہت و نور، معصومیت، اور تب و تاب کے خزینے حاصل کئے اور اپنی شخصیت میں جاندار اور صحت مند عناصر کا اضافہ کیا نورا والی نظم میں اگرچہ شاعر کا کردار ایک الھڑ نوجوان کا ہی ہے لیکن اس عورت کی نقش گری میں پاکیزگی اور عصمت کا رنگ ہی سب سے گہرا ہے۔

وہ فردوسِ مریم کا اک غنچۂ تر   وہ تثلیث کی دخترِ نیک اختر

وہ پُر رعب تیور وہ شاداب چہرہ
متاعِ جوانی پہ فطرت کا پردہ

مری حکمرانی ہے اہلِ زمیں پر
یہ تحریر تھا صاف اس کی جبیں پر

سفید اور شفاف کپڑے پہن کر
مرے پاس آتی تھی اک حور بن کر

وہ اک آسمانی فرشتہ تھی گویا
کہ انداز تھا اُس میں جبریل کا سا

وہ اک مرمریں حور خلدِ بریں کی
وہ تعبیر آذر کے خوابِ حسیں کی

اور پھر اس کے کردار میں معصومیت کا یہ عنصر کہ

نہیں جانتی ہے مرا نام تک وہ
مگر بھیج دیتی ہے پیغام تک وہ

ننھی پجارن میں بھی یہی معصومیت مجازؔ کے لیے جاذب توجہ ہے کہ "یہ ننھی سی سیتا"

خود تو آئی ہے مندر میں
من اس کا ہے گڑیا گھر میں

عبادت کی ہیروئین بجائے معصومیت کے شباب کی شوخیوں سے مملو ہے۔

اک اک ادا میں سیکڑوں پہلوئے دلدہی
اک اک نظر میں پرسش پنہاں لیے ہوئے

لیکن مجازؔ کی توجہ اس موقع پر بھی عورت کی جنسی دلآویزی کے بجائے اس کی جمالیاتی پاکیزگی اور لطافت کی طرف رہی ہے۔

رخسار پر لطیف سی اک موج سرخوشی
لب پر ہنسی کا زمزمہ سا طوفاں لیے ہوئے

پیشانیٔ جمیل پہ انوار تمکنت
تابندگی صبحِ درخشاں لیے ہوئے

اسی طرح مادام میں یہ عورت اپنی تمام تر زلیخائی کے ساتھ مجازؔ کے سامنے آتی ہے لیکن اس کی یوسفیت اس کا دامن چاک نہیں ہونے دیتی۔ اگرچہ اس کا فرادائی کی مکمل نقش گری مجازؔ کے موقلم کا ایک اعجاز ہے۔

زلف کی چھاؤں میں عارض کی تب و تاب لیے
لب پہ افسوں لیے آنکھوں میں مے ناب لیے

نشۂ نازِ جوانی میں شرابور ادا
جسم ذوق گہر و اطلس و کمخواب لیے

لب گلرنگ وحسین جسم گداز وسیمیں	شوخیٔ برق لیے لرزش سیماب لیے
ایک صیاد خوش اندام سواد مشرق	زلف بنگال لیے طلعت پنجاب لیے
نزہت د نار کا اک پیکر شاداب وحسین	نکہت ونور کا اڈا ہوا سیلاب لیے

مجازؔ کی ان نظموں کا اگر مجازؔ کے پیش رو جوشؔ کی ان نظموں کے ساتھ مطالعہ کیا جائے جو عورت سے متعلق ہیں تو ایک بات کا اندازہ ہوگا جوشؔ کا رویہ عورت کے ساتھ خالص جاگیر دارانہ ہے یعنی اپنی بہو بیٹوں پر تو وہ قدغن لگاتے ہیں ۔ اور انھیں خاتون مشرق بننے کی تلقین کرتے ہیں لیکن مہترانی اور جامن والیاں ان کی ہوس کا آلہ کار بنتی ہیں۔ اس کے برخلاف مجازؔ کا نقطۂ نظر جدید اور ایک صحت مند رومانی کا نقطۂ نظر ہے نیز عورت کے متعلق اس کا شعور ایک بیدار اور صالح شعور ہے مجازؔ کی شاعری میں جیتی جاگتی عورت کا پیکر ہے لیکن اس پیکر میں مجازؔ نے ہمیشہ معصومیت ،حیا، مریمی تقدس، صحت مند بغاوت اور رفاقت و ولداری کے عناصر کی تلاش کی ہے۔عورت مجازؔ کی شخصیت اور شاعری کا محور بھی ہے اور اس کی بہت بڑی محرومی اور تشنگی بھی لیکن اس کے ناتواں جسم میں نہ جانے کہاں سے اتنا کس بل آگیا تھا کہ وہ کبھی گھٹن یا جنسی تلذذ کا شکار نہیں ہوا ۔ اس نے اپنے جسم کو میکدے کی آگ میں جلا ڈالا لیکن اپنے ذہن کو نفسیاتی پیچیدگیوں اور مریضانہ رجحان سے محفوظ رکھا۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو اسے تمام رومانی شعراء میں ممتاز کرتی ہے۔ جس کا اعتراف ادب کا ہر صاحب ذوق نقاد کرے گا۔

قمر رئیس

نیم شب

(غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد)
غالب

چاند نکلا تھا، مگر دیر ہوئی ڈوب گیا

مضمحل راہگذاریں، یہ تھکے ہارے درخت
سر جھکائے ہوئے سمٹے ہوئے اکتائے ہوئے
اک دھواں ایک دھندلکا سا رواں ہے ہر سو
رات کی مانگ سے افشاں بھی اُڑی جاتی ہے
قمقمے راہ کے، سہمی ہوئی پہنائی میں
اک دہکتی ہوئی زنجیر نظر آتے ہیں
کہر آلود ہوائیں، یہ اُداسی کا فسوں
رات اک خواب گراں ہے کہ جگا بھی نہ سکوں
....
....
....
....

ارضِ رومان کی سنسان گذرگاہوں پر
شاعرِ شہرِ نگاراں کا خیال آتا ہے
وہی آوارہ وہی سرکش و رومان مزاج
راز رازوں کا ، بلا نوش بلا نوشوں کا
'شہر یاروں سے رقابت کا جنوں' تھا جس کو
گلعذاروں کی محبت کا جسے سودا تھا
وہ جو اپنے ہی تراشے ہوئے بت پا نہ سکا
لوٹ کر 'کوئے ملامت' سے کبھی آ نہ سکا

....

میں بھی اُس شہرِ نگاراں سے بہت دُور ہوں آج
شوخیِٔ چشمِ غزالاں سے بہت دُور ہوں آج
یہ دھندلکے ، یہ منارے ، یہ مقدس در و بام
علم و تہذیب کے اس کہنہ صنم خانے میں
سیکھنا ہیں ابھی آدابِ پرستش مجھ کو
ابھی دیوانگیٔ شوق کے ہاتھوں میں بھی
بے نوا بے سر و سامان رہا ہوں اب تک
اور یہ دن بھی بہر حال گذر جائیں گے

....

....

میری درماندہ خیالی، میری افسردہ دلی
سوچتا ہوں مرے ماحول کی پروردہ ہے
(یہ چمن یوں تو بہت روح فزا ہے لیکن
میں ابھی اس کی روایات سے مانوس نہیں)
ورنہ تنہائی کبھی اتنی گرانبار نہ تھی
ذہن میں تلخئ افکار تھی پیکار نہ تھی
اب یہاں دل کے دھڑکنے کی صدا کوئی نہیں
رازِ دل کوئی نہیں، رمزِ وفا کوئی نہیں

چاند نکلا تھا، مگر دیر ہوئی ڈوب گیا
آؤ اب لوٹ چلیں، دُور نکل آئے ہیں

مجاز اور عشق

قاضی عبدالستار

انسان کی کوئی نسل خالی الذہن اور سادہ دماغ نہیں پیدا ہوئی۔ لیکن ادبیات کی تاریخ میں ایسی عہد آفرین نسلوں کا فقدان نہیں ہے جنھوں نے اپنے ادبی ورثے کو نئی دنیاؤں کے تاج پہنائے ہوں جب اردو ادب کی نئی تاریخ لکھی جائے گی تو مجازؔ کی نسل بھی ایسی ہی مقتدر اور خلّاق نسلوں کی فہرست میں مرقوم ہوگی جس عہد میں اس نوجوان نسل نے اپنی میراث میں پائی ہوئی دنیا سے نکل کر نئے جہانوں کی تسخیر کا عزم کیا اور اپنے کاندھوں پر نئے ادبی پرچم سجائے وہ ایک بحرانی دور تھا۔ اقبالؔ فکر و فن کے نئے میزان پر قوم و ادب کی سیرت تول رہے تھے۔ جوشؔ "انقلاب" کی دلہن کی رونمائی کا شرف حاصل کر رہے تھے۔ اصغرؔ ادب کی خانقاہ میں تصوف کی بوسیدہ مسند بچھائے بیٹھے تھے۔ فانیؔ زندگی کے ویرانے میں موت کے زانوں پر سر رکھے اُس سے راز و نیاز کر رہے تھے حفیظؔ قرونِ اولیٰ کی اسلامی زندگی میں اپنے زخموں کا مرہم ڈھونڈکر تھک چکے تھے۔ بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کی آتشیں تقریروں میں غلامی کی گرانبار زنجیر پگھلتی نظر آ رہی تھی۔ روس اور فرانس کے انقلابوں نے جوان دلوں کی دھڑکنیں تیز کر دی تھیں مغربی ادب اور روسی فلسفے سے مسلح نئی نسل ایک طرف اقبالؔ کو فاشزم کا شکار سمجھ رہی تھی اور دوسری طرف اردو شاعری کے "تاج محل" کو انحطاطی تمدن کی پروردہ درباری چیز سمجھ کر مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہی تھی یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ اس نسل سے دیوانِ غالبؔ کو شعری مجموعوں کی الماری سے نکال کر مقدس صحیفوں کی صف میں رکھ دیا تھا۔ اس اندازِ پرستش کا اگر مطالعہ کیا جائے تو نہ صرف عہدِ غالبؔ کی تلخ کلبیت اور شیریں تشکک کا احساس ہوتا ہے بلکہ اس نسل کی تقدیر میں لکھے ہوئے

پرآشوب زمانے کا شعور بھی ہوتا ہے جس نے ماضی سے محبت، حال سے آسودگی اور مستقبل سے یقین چھین لیا تھا۔

ایلیٹ اور آڈن کا آوارہ تفکر، ڈارون اور فرائڈ کی مجہول حیوانیت اور جبلیت اور مغربی رومان نگاروں کی فکری کجروی کے ہاتھوں یہ "کارواں" ان دیکھی دنیاؤں میں بھٹکتا رہا اور آخرکار مارکس کی رہنمائی میں انسانی کردار کے ہاتھوں دنیا کی نئی تفسیر لکھنے پر رضامند ہوا۔ یہیں سے "ادب برائے زندگی" کے نظریے نے اپنی صحت اور بقا کے لیے فلسفیانہ ادراک کیا۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ یہ روایت اردو شاعری میں نئی ہے۔ کیونکہ اردو شاعری دربار سے زیادہ بازار اور خانقاہ سے منسلک رہی ہے۔ ، زندگی، زندگی کے دکھ درد اور انسان، انسان کی شکستوں اور ناکامیوں سے اردو شاعری بھری پڑی ہے۔ لیکن چونکہ اردو شاعری کی زبان اتنی ہمہ گیر اور وسیع ہے کہ ہم کسی ایک شعر سے عموماً دو متضاد معنی اخذ کر سکتے ہیں۔ اس لیے ادب کے عام طالب علم کو داخلیت، اجتماعیت سیاست اور معاش کی قطعی تفریق میں دقت ہوتی ہے اس لیے ہم کچھ اپنی سہل پسندی اور کچھ انسان اور زندگی سے متعلق اہم افادی مضامین کی کمی کے باعث غلط نتائج اخذ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں یہ صحیح ہے کہ قوم کی سیاسی، سماجی اور معاشی تقدیر رقم کرنے والا حکمران طبقہ عیش کے تخت پر بیٹھا رہا اس کے حضور میں شاعر گاتا رہا رقاصہ ناچتی رہی مصور تصویر بناتا رہا اور بیمار زندگی طلائی زنجیروں میں جکڑی ہوئی اس کے قدموں میں لیٹی رہی لیکن اردو شاعر ایسے صدہا اشعار اپنے دامن میں سمیٹے کھڑی ہے جس سے انسانیت اور زندگی کے خون کی بو آتی ہے۔ ؎

کیا ہوا مر گیا اگر فرہاد
روح پتھر سے سر پٹکتی ہے
آبرو

لگتی ہے اب تو قلقل مینا سے دل کو ٹھیس
وہ دن گئے کلیمؔ کہ یہ شیشہ سنگ تھا

اتنی فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آزاد ہم
مرزا مظہر

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے — سودا

گُل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا — میر

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں — میر

ہم بھی تمھیں بتائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ ہستی سے گر ملے — غالب

عشق و مزدوریِ عشرت گہہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکوکامیٔ فرہاد نہیں — غالب

لیکن اردو شاعری کا یہ مقدس لہجہ مصنوعی محبت کے نقار خانے میں تقریباً گم ہو گیا تھا سب سے پہلے حالی کو ان مروجہ بوسیدہ مضامین کی عفونت کا احساس ہوا تھا۔ اقبال نے اسی بنیاد پر وہ محل تعمیر کیا جس کے کنگروں پر ماہ و انجم کے آشیانے ہیں۔ مگر مجاز کی نسل نے اس نظریے (ادب برائے زندگی) کی جس شدت اور کامیابی سے ترویج و تبلیغ کی وہ ایک طرف اپنے عہد کی سب سے اہم اور پاک ادبی خدمت بھی ہے اور دوسری طرف ایک نئے جہان کی فتوحات کی حقدار بھی یہ بات قابل غور ہے کہ اس نئے ادبی کاروان میں کوئی "خضر" کا منصب ابھی تک نہیں پا سکا ہے

فیض احمد فیض نے مجاز کو انقلاب کا مطرب کہا ہے اثر لکھنوی کا ارشاد ہے" اردو ادب میں ایک کیٹس پیدا ہوا تھا جسے بھیڑیے اُٹھا لے گئے"، قطع نظر اس کے کہ انقلاب کی پیغمبری کا منصب اب بھی خالی ہے اور اردو ادب کے کیٹس کو بھیڑیے اُٹھا لے گئے تھے یا وہ بھیڑیوں ہی کے لیے پیدا ہوا تھا جس کا مطلب

مسئلہ ہے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مجاز اپنی نظموں اور غزلوں کا مختصر سا مجموعہ لے کر بزرگوں کی محفل سے گذرا تو انھوں نے بسر و قد کھڑے ہو کر اس کے فن کا احترام کیا اور جب وہ نوجوانوں کی بزم میں آیا تو انھوں نے اُسے اپنے کارواں کے سالاروں کی صف میں بٹھالیا۔ ہر اچھے فنکار کی شخصیت میں کوئی چھپا ہوا نقاد ہو یا نہ ہو لیکن مجاز میں ضرور تھا۔ "آہنگ" کا انتساب کسی شاعرانہ جذبے کے جذباتی مصوّری نہیں ہے بلکہ ساری ترقی پسند شاعری پر بے لاگ تنقید ہے۔ فیض اور جذبی دونوں انفرادی تجربات کے پروردہ جذبے کو عمومیت¹ اور آفاقیت کی دشوار منزلوں سے گذار کر تفکر کے قریب لاتے ہیں اور مخدوم وسردار ساری زمین پر چل کر نئے نئے افادی موضوعات کی جستجو کرتے ہیں پھر اپنے آتشیں لہجے کی مبارک گھن گرج کا لباس پہناتے ہیں۔ مجاز نے ان دونوں کے درمیان اپنے مقام کا تعین کر کے ایک ادبی خدمت انجام دی ہے۔ مجاز کی شاعری کا ذکر کرنے سے پہلے رومانیت کا تذکرہ ضروری ہے۔ اردو ادب کے کچھ اہم نقاد اُن نقادوں سے متفق نہیں ہیں جو اردو ادب پر رومانوی تحریک" کے نمایاں اثرات محسوس کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے ادب میں شعوری طور پر رومانیت ایک تحریک کی صورت میں نہیں آئی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ عصر جدید کے بہت سے اہم شعرا نے اسی مقدس آتش خانے سے اپنے نغموں کے لیے سوز چرایا ہے۔ جوش کی انقلابی شاعری جو انقلاب کے فلسفیانہ شعور کے بجائے انقلاب کی داخلی آرزومندی کے معصوم خواب دکھلاتی ہے۔ اختر شیرانی کی وہ عشقیہ شاعری جو ایام جاہلیت کے منچلے عرب شاعر کی بیقرار روح کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ دونوں رجحان نصرف رومانیت کے گنگا جمنی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں بلکہ رومانیت کی تعریف پر پورے اترتے ہیں۔ رومانی کا حسین تخیل اور شدید احساس اپنی مجنون آرزو کی اسیری میں کبھی ہر روایت کی کے خواب دیکھتا ہے۔ اور کبھی اپنی انفرادیت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی ایک مروجہ اخلاقی یا سیاسی نظام اقتدار کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔ اس کی بے چین تخیل اور فطری اداسی اُن قدسیوں کے شبستانوں میں کجکلاہی کے خواب دیکھتی ہے جن کے ذکر سے اُس کی مادّی زبان جلتی ہے جب سنگین

۱۔ GENERALIZATION.

حقیقتوں کی ٹھوکر سے اس کے ذہنی نگار خانے شیشے کے کھلونے کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں تو اس کے لہجے کی تلخی، تخیل کی پرواز اور جذبے کی شدت کی اور تیزی آجاتی ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ رومانی کے ایک ہاتھ میں خون آلودہ شمشیر کا قبضہ نظر آتا ہے اور دوسرے میں کسی قتالۂ عالم کا دست حنائی۔ شیلی نے زرنگار کالوں کے بحر میں ستارے بھی بوئے ہیں اور آئرلینڈ کی آزادی کے لیے تلواروں پر باڑھ بھی رکھی ہے۔ بائرن نے انگلستان کی نازنینوں کے لیے قصیدے بھی کہے ہیں اور یونانیوں کے لیے رجز بھی اور انگریزی ادب اِن دونوں رومان نگاروں پر فخر کرتا ہے۔ اردو شاعری میں نہ صرف مجازؔ بلکہ تقریباً تمام نئے اہم اور مقبول شاعر رومانیت کی یہی "دھوپ چھاؤں" پہنے کھڑے ہیں۔ فیضؔ جس نے پوری ایک نسل کو متاثر کیا ہے جہاں کہیں بھی کاجل کی لکیر اور غازے کے غبار سے اپنا دامن بچانا چاہتا ہے اس کے نغموں کی تاثیر مدھم ہو جاتی ہے۔ سردارؔ ایسے پرجلال شاعر کے بلند آہنگ میں بھی اسی تیر نیمکش کی پرفکر بیقراری کا احساس ملتا ہے۔ جذبیؔ نے موضوعاتی اور ہنگامی شاعری سے اپنے آپ کو بڑی دلیری اور کامیابی سے بچائے رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں انقلاب پر منظوم تقریروں کے بجائے انقلاب کی روح کے عکس ملتے ہیں۔ ساری نسل میں شاید ہی کوئی ایسا قابل ذکر شاعر ملے جس نے بیک وقت غمزہ و شمشیر دونوں کی آرزو نہ کی ہو۔ یہی آرزو ان کی رومانیت کا درخشاں ثبوت ہے رومانیت کا وجود کسی بھی فنکار کی واجب ادبی اہمیت کو کم نہیں کر سکتا۔ رومانیت صرف ابہام، اشاریت مریضانہ اضلیت اور آوارہ جذباتیت ہی کا نام نہیں ہے۔ اس کی فطری تشنگی اور ابدی اضطراب ہر روایت کے طلسم توڑنے کی قسم کھاتا ہے۔ وہ تمام قدریں جو اس کے راستے میں کانٹے بوتی ہیں اگر اس کے غضب کا نہیں تو نفرت کا شکار ضرور ہوتی ہیں۔ وہ دنیا کی کسی لعنت سے خواہ وہ کتنی ہی زریں ہو سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی اُس کے شدید احساس اور بیتاب تخیل کو نیند نہیں آتی وہ شب زیست کے ہر لمحہ میں ستارہ شمار رہتا ہے۔ مجازؔ نے بھی اسی بیقرار آرزومندی کے زخم کھائے ہیں ؎

دیوانہ وار ہم بھی پھریں کوہ و دشت میں

دلدادگان شعلہ محمل میں ہم بھی ہوں

طفلی کی یہ آرزومندی اگر ارمانوں کی ایسی منزل پر سو جاتی تو اس شاداب صبح کی رحمتیں کہاں جاتیں جن کے نور میں ایک نسل کی بیدار آنکھوں کے موتی پوشیدہ ہیں۔ اپنے عہد کے مکمل کرب نیم بیداری نے مجاز سے یہ شعر بھی کہلوایا ہے۔

چمکے ہمارے ہاتھ میں بھی تیغ آبدار
ہنگام جنگ زرغۂ باطل میں ہم بھی ہوں

مجاز کی اسی دو عملی شخصیت کی بنا پر ڈاکٹر محمد حسن نے اُسے قرون وسطی کا نائٹ کہا ہے جو بزم میں خم لنڈھاتا ہے اور رزم میں کفن پوش رہتا ہے۔ اگر ان دو مذکورہ بالا اشعار کا تجزیہ کر کے ان میں ربط ڈھونڈھا جائے تو اس دور کی حسرتناکیاں آئینہ ہو جاتی ہیں۔ شاعر اپنی مضطرب عشقیہ فطرت کے ہاتھوں شعلہ محل کے دلدادہ ہونے کی جذباتی آرزو رکھتا ہے۔ لیکن یہ حریری خواب تعبیر کی خاردار وادیوں میں آتش زیر پا ہونے سے پہلے ہی پرسوز فکر کے ہاتھوں جھلس جاتا ہے کیوں کہ اس کے خیالوں کی شہناز غیر مساوی یا نہ طبقاتی تقسیم کے آہنی قلعے میں اسیر ہے دولت کا مہیب دیو اس کی پشت پر مجہول روایات اور بوسیدہ اقدار کا لشکر لیے دربانی پر کھڑا ہے۔ گرمی خیال کے آبگینوں اور بے خواب آنکھوں کے جھوٹے موتیوں کے سوا اس کے دامن میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک سچے رومانوی کی طرح شاعر دوسرے درجے کے آئیڈیل سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا پھر وہ کرے کیا۔ زرغۂ باطل میں لڑتے لڑتے جان دے دینے کے علاوہ بھی کوئی چارہ ہے؟

لشکر کے پیش پیش مقابل میں ہم بھی ہوں

یہاں لشکر کا لفظ انفرادی غم کو اجتماعی لباس پہناتا ہے۔ شاعر یہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ اس مدقوق سماج اور بیمار نظام میں صرف اُسی کے دل کا خون نہیں ہوا ہے بلکہ ایک کثیر آبادی اپنے کاندھوں پر ارمانوں کا جنازہ اٹھائے زندگی کا فرض ادا کر رہی ہے۔ عشق زندگی کی بنیادی قدر نہ سہی لیکن ایک اہم قدر ضرور ہے۔ فاقوں سے تنگ آ کر خودکشی کرنے والے تنہا نہیں ہیں ان کی ہمدمی میں ستم پیشہ محبت کے مارے ہوئے انسانوں کا قافلہ بھی ہے۔ اسے آپ ذہن کی کجروی اور فکر کی رہزنی کہہ سکتے ہیں مگر اس کے

وجود سے انکار مشکل ہے۔ تاریخ ایسی شخصیتیں اپنے اوراق میں چھپائے بیٹھی ہے جن کی عظمت کی پشت پر مہ جبینوں کا پنجۂ عشق رہا ہے۔ عشق کے پتھر نے کردار کی شمشیروں پر باڑھ بھی رکھی ہے اس میخانے میں کجکلاہوں نے فقیروں کے جھوٹے جام نوش کیے ہیں فیض کے یہ اشعار

عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی ہے
یاس وحرمان کے دکھ درد کے معنی سیکھے
زیردستوں کے مصائب کا سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے رخ زرد کے معنی سیکھے
جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

یہ اسی عشق کی بازگشت ہے جو اردو کی کلاسکی شاعری کا اوّلیں دورِ شباب ہے اشعار کی مثال نہیں دوں گا کیوں کہ

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی

مگر میرزا جان کی اس وصیت کا ذکر ضرور کروں گا جو انھوں نے اپنے بیٹے میرزا جاں جاناں کو کی تھی یہ وہ لوگ تھے جن کا احترام کرنا انحطاط پذیر مغل دربار اپنی سعادت سمجھتا تھا۔

"ہر کہ دلش عشق برشتہ نمی شود و خاشاک طبیعت او سوختہ و پاک نمی گردد زمین طبیعت او صلاحیتِ تخمِ محبت الٰہی ندارد"

مجازؔ بھی اسی عشق کے شیشے میں کھینچ کر تلوار ہوا ہے۔ اسی وار کی بلندی سے آہستہ گام سحر کی سواری دیکھی ہے جب بھی کارزارِ ہستی میں اس کے بازو شل ہوئے ہیں اسی شجرِ ممنوعہ کی چھاؤں میں دم لے کر ہستی کی طنابیں کھینچی ہیں۔ مجاز کی شاعری میں عشق پر شرمندگی نہیں ملتی حالانکہ ان کے اکثر ہمعصروں نے اپنی

محبوباؤں سے جنگ کی آگ میں کودنے کی اجازت مانگی ہے اوران کی کاکلوں کے رخصتی پیار لیکر شمشیر وسنان کے زیور پہنے ہیں پشیمانی کا یہ فقدان اورعشق کے تذکروں کی گرمی

ع عشق ہی عشق ہے دُنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں
نشۂ نرگس خوباں مجھ سے
غازۂ عارض ورخسار ہوں میں
لے کے نکلا ہوں گہرہائے سخن
ماہ و انجم کا خریدار ہوں میں
اہل دنیا کے لیے ننگ سہی
رونق انجمن یار ہوں میں

اس کی محبت کو عبادت بناتی ہے وہ ایک کارنامے کی طرح اپنی داستاں سناتا ہے اور فخر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجاز کی نظمیں پڑھکر اُس کے عشق پر ترس نہیں آتا بلکہ رشک ہوتا ہے۔ دل پر وہ ٹھیس نہیں لگتی جو آنسوؤں کی پیشوائی کرتی ہے بلکہ وہ چوٹ پڑتی ہے جس سے سرمست لوگ بیدار ہوتے ہیں اسی عشق کی کارفرمائی سے غم ایام کے دفتر کھلتے ہیں اور رزمگاہ حیات میں لشکر سجتے ہیں

ع افق پر جنگ کا خونیں ستارہ جگمگاتا ہے
ہر اک جھونکا ہوا کا موت کا پیغام لاتا ہے
گھٹا کی گھن گرج سے قلب گیتی کانپ جاتا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں
مرتب اک نیا دستور ہو گا
بنا اک اور نیو کی پڑھ رہی ہے
سکون زیر تقدیس کلیسا

گداز امت خیر البشر بھی
ابھی تو کائنات اوہام کا اک کارخانہ ہے
ابھی دھوکا حقیقت ہے حقیقت اک فسانہ ہے
ابھی تو زندگی کو زندگی کر کے دکھانا ہے
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

چہروں پہ ماز یانۂ افلاس کے نشاں
ہر ہر ادا سے بھوک کی بے تابیاں عیاں
پیسہ اگر ملے تو حمیت بھی بیچ دیں
روٹی کا آسرا ہو تو عزت بھی بیچ دیں

یہ اشعار بغیر کسی ترتیب اور تلاش کے لکھ دیے گئے ہیں لیکن ان کی آگ جس آتش خانے سے ملائی گئی ہے وہ عشق ہی ہے۔ اسی کوچے کی ٹھوکروں سے مجاز کی معصومیت کو سخت گیر زمانے کے تشدد کا عرفان کرایا ہے اسی بزم کے کہنہ جام میں اس نے زندگی کو بے نقاب اور دنیا کو برہنہ دیکھا ہے یہ میرا نہیں مجاز کا دعویٰ ہے

مجھے شکوہ نہیں دنیا کی ان زہرہ جبینوں سے
ہوئی جن سے نہ میرے شوق رسوا کی پذیرائی
زمانہ کے نظام زنگ آلودہ سے شکوہ ہے
قوانین کہن آئین فرسودہ سے شکوہ ہے

شہاب جعفری

گنہگار فرشتے

(مجاز کی یاد میں)

سنبھال کر مرے ہم نوش، ارے شراب ہے یہ!
اک ایک قطرہ ہے اپنے ہی خونِ دل کی کشید
اک ایک قطرۂ مے زندگی کا زہر بھی ہے
اسی کو آج بھی پینا ہے کل بھی پینا ہے
نہ جانے کب تک ابھی اور یونہی جینا ہے

اِسی کے واسطے بدنام ہیں زمانے میں
عجب جگہ ہے سلامت رہے یہ میخانہ
کہاں کہاں سے یہاں آ کے جمع ہیں ہم لوگ
یہ میکدہ ہے یہاں دل کی آگ روشن ہے
ذرا سکون سے بیٹھے ہیں غم کے مارے ہوے

جلا وطن ہیں، غریب الدیار ہیں ہم سب
کسی قصور پہ بن باس عمر بھر کا ہے

نہ ماں کی گود میسر نہ باپ کا سینہ
نہ دوستوں کی مروّت نہ اجنبی کا خلوص
نہ ہم کو پیار کا حق ہے نہ روزگار کا حق
غمِ شباب سے محروم عشق سے محروم
کسی نے چھین لیا ہے نگاہِ یار کا حق

ہمارے نام کی سب نعمتیں ہیں دنیا میں
حیا سرشت تھے دنیا سے کچھ نہ مانگ سکے
کسی کے سامنے دستِ سوال اُٹھ نہ سکا
نہ کام جوئی تھی فطرت نہ بھیک تھی عادت
کسی کے آگے سرِ پُر غرور جُھک نہ سکا
ادائے حسن طلب بھی نہ ہم کو آتی تھی
کسی سے حسن طلب کی ادا نہ سیکھ سکے
ہمیں بھی حسن کی اک اک ادا بھاتی تھی
مگر ہم اہلِ ہوس کی وفا نہ سیکھ سکے

کوئی متاع کہاں تھی متاعِ دل کے سوا
وفا کے نام پہ سب کچھ لٹا کے بیٹھے ہیں
جہاں میں کون ہمارا ہے کس کو پیار کریں
یہاں خلوص ملا ہے تو آکے بیٹھے ہیں
اٹھاؤ ساغرِ مے دوستو کہ دَور چلے

نظر ملا کے محبت کا جام ٹکراؤ
غمِ حیات غمِ روزگار کیا شے ہے
یہاں کسی کو اجازت نہیں ہے آنے کی
کسی کو حق نہیں ہم بیخودوں کی پرسش کا
ہماری چارہ گری کرنے والی دنیا کون
یہ کس نے آکے درِ میکدہ پہ دستک دی
ارے کہو ہمیں فرصت نہیں ہے ملنے کی
یہ بزمِ مے ہے یہاں ناصحوں کا کام نہیں
یہ دن کے لوگ ہیں شب میں کہاں نکل آئے
پیو پیو کہ ابھی ساری رات پینا ہے
یہ عمر تھوڑی نہیں صبح تک تو جینا ہے

اندھیری رات کا سورج یہ ساغرِ مے ہے
فروغِ نشہ میں کتنی حسین ہے دُنیا
کہ جیسے مائلِ پرواز ہونے والی ہو
ہمیں اُڑائے لئے جائے گی، کہیں سے کہیں
کہ جیسے راہ میں حائل، نہ آسماں نہ زمیں

فضا میں پھر وہی جگنو چمک کے ڈوب گیا
تو دل میں پھر وہی طفلی کی آرزو جاگی
کہ جس کی گود میں جائیں وہ ہم کو پیار کرے

جو چاہیں مانگ لیں، جو مانگیں جس گھڑی، مل جائے
پھر اس کی گود سے اٹھیں تو بھاگ جائیں کہیں
جدھر کو چاہیں نکل جائیں مُنہ اٹھائے ہوئے
کہ ماں کے دودھ کے نشّے میں بیخود و سرشار
بڑھے چلیں کبھی گرتے کبھی سنبھلتے ہوئے
زمیں پہ ٹھیک سے اپنے قدم پڑیں نہ پڑیں

چلیں ستاروں کی دنیا میں چل کے سیر کریں
ہَوا میں خوب اُڑیں بادلوں سے شرط لگائیں
نہ جی بھرے تو ہنڈولے میں چاند کے جھولیں
اس آسمان سے اُس آسمان کو چھولیں
فرشتوں سے ملیں جنت کی سَیر کو نکلیں
گلے میں بانہیں دیے ٹولیاں بنائے ہوئے
روش روش پہ چلیں قہقے لگا کے ہنسیں

اور اپنے گھر کی طرح اپنے گھر سے دُور کہیں
زمیں پہ ایک گھروندا بنائیں پیارا سا
حسین چاند خیالوں کی اک حسین دُلہن
اب اِس سے بیاہ رچائیں اب اِس کو بیاہ کے لائیں
ستارے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں بچپن میں
اِنھیں بُلائیں براتی کبھی کا وعدہ نبھائیں

الکبر

ہوائیں دھیمے سُروں میں بجائیں شہنائی
برات اُٹھے چراغاں ہو کہکشاں کی گلی
یہ کائنات مری ماں بنے، بلائیں لے
یہ زُہرہ بن کے بہن سر پہ ڈال دے آنچل

نُزولِ رحمتِ پروردگار کی شب ہو
فضا کو نیند سی آئے فرشتے سایہ کریں

غمِ شباب میں طفلی کی آرزو ہے جواں
اندھیری رات کا سورج، کہاں ہے ساغرِ مے؟
عروجِ نشہ ہے ہم نوش اک اور ساغر دے
یہ جام آج چھلک جائے اس قدر بھر دے
میں تشنہ کام ہوں خالی ہے میرا پیمانہ

—.~.~.—

مجاز کی شاعری

رفیع اللہ عنایتی

مجاز ایک ننھے سے بھولے بھالے دل کا شاعر ہے۔ جذبات، احساسات اور وجدان اس کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ عقل کے حلقۂ زنجیر میں وہ اپنے کو اسیر کرنے پر آمادہ نہیں ہے اسے حسن سے محبت ہے۔ وہ شیلی کی طرح بیتاب، کیٹس کی طرح حسن پرست اور بائرن کی طرح جوشیلا ہے۔ وہ مسلم روایات کا باغی ہے۔ سماجی جکڑ بند سے خود کو اور عوام کو آزاد کرانا چاہتا ہے۔ غرض وہ ایک بھرپور رومانی شاعر ہے۔ اسلوب احمد انصاری اپنے ایک قابل قدر مقالہ" علی گڑھ اور رومانی نثر کے معمار" میں رومانیت کے عناصر ترکیبی کو اس طرح بیان کرتے ہیں" بہر کیف ماضی سے عقیدت، حُسن کی تلاش وفور جذبات، مرکزیت سے گریز، جذبہ، احساس اور وجدان پر بھروسہ، تخئیل کی خودکفالتی، بہم کی امنگ، زندگی کے ہیولیٰ کو منقلب کرنے کا جذبہ، زبان میں صحت، صفائی اور وضاحت سے بڑھ کر ترنم، اشاریت اور مطالب کی تہوں کی وسعتوں پر زور رومانیت کے عناصر ترکیبی قرار دیئے جا سکتے ہیں"۔ (فن کار صفحہ ۳۲) رومانیت کے ان عناصر ترکیبی میں سے جن کو اسلوب صاحب نے بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے مجاز کے یہاں صرف حسن کی تلاش، وفور جذبات، مرکزیت سے گریز، جذبہ، احساس اور وجدان پر بھروسہ، زندگی کے ہیولیٰ کو منقلب کرنے کا جذبہ اور زبان میں صحت کی صورت میں ملتے ہیں۔

مجاز کے یہاں تاریخی شعور نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں غالب، اقبال، حسرت، فراق اور فیض کی طرح انتخابیت نہیں ہے۔ اس کو کبھی بھی یہ احساس نہیں ستاتا کہ اس کے فن پارے کبھی

ادب کی "جمالیاتی عالمگیریت" کے سلسلہ کی ایک کڑی ہوں۔ اور ایک حیثیت سے وہ جتنے نئے ہوں اس سے زیادہ پرانے ہوں۔ اور اس کی شاعری میں ماضی سانس لے رہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مذکورہ بالا شعراء کی صف میں نہیں آتا۔ لیکن اچھے شاعروں میں ضرور اس کا شمار ہوتا ہے۔ میں فراقؔ گورکھپوری کی اس رائے کو بڑی اہمیت دیتا ہوں" ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ روس میں بھی اب بہت سے لوگ یہ سوچنے لگے ہیں کہ ترقی پسند ادب کے بہت سے ادیب قدیم ادب سے بہت ناکافی استفادہ کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ تہذیب و ادب انقلابوں کے باوجود اپنے سلسلوں اور سرچشموں سے اگر بے نیاز ہو گئے تو سخت گھاٹے میں رہیں گے۔ دنیا کی سب سے پرانی دستیاب رگ وید سے لے کر ٹینی سن، سوئنگ برن، ٹالسٹائی، ٹیگور، اقبال، غالب اور انیس تک ادب میں دوسروں کو متاثر کرنے کے جو طریقے اور فنی معجزے ہمیں ملتے ہیں۔ اگر انھیں ہم نے حاصل نہیں کیا تو محض ترقی پسند مقاصد ہم سے بڑے ادب کی تخلیق نہیں کرا سکتے .... ہمیں وجدانیت کے رموز کو سیکھنا ہے اور غیر مارکسی ادب سے ہم وجدانیت کے رموز اور جمالیات کے نکات سیکھ سکتے ہیں اور انھیں اپنے ادب میں سمو کر مارکسی ادب میں چار چاند لگا سکتے ہیں۔ قدیم ادب کی اسپرٹ کو ہمیں اپنے اندر سمونا ہے۔ یہ محض قدیم ادب کے مطالعہ سے ممکن نہیں بلکہ اس اسپرٹ سے ہم آہنگ ہونے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم قدیم ادب کے حال و قال کا بھید نہ پا سکے تو ہمارا ادب ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی ایک اکھڑے پتنگ کی حیثیت رکھے گا" (شاہراہ ۔ فروری ۱۹۵۶ء ۔ باقی صفحہ ۶)

مجازؔ جس عہد کی پیداوار ہے وہ ایک انتشار کا دور تھا۔ پرانے ادارے اپنی عمر پوری کر چکے تھے۔ انقلابی آواز سامراجی نظام اور پرانی قدروں کے خلاف پوری شدت کے ساتھ بلند ہو چکی تھی مذہب اور سرمایہ داری کی پول بھی اچھے طریقہ سے کھل چکی تھی۔ وہ گھڑی "میلاد آدم" کی گھڑی تھی دلیس کے مزدور، کسان اور دوسری انقلابی طاقتیں کافی بیدار ہو چکی تھیں۔ ایک طرف تو پرانا نظام دم توڑ چکا تھا اور دوسری طرف نئی اقدار کو جنم دینے کی خواہش زوروں پر تھی۔ یہ حالات تھے جب مجازؔ کی شاعری کے بال و پر نکلے اور اس نے پوری آزادی کے ساتھ فضا میں اڑنا شروع کیا۔

علاوہ ازیں اس کی شاعری پر ملکی حالات کے علاوہ دوسرے ممالک کی ہواؤں کا بھی اثر ہے۔ "محنت و سرمایہ" کی عالمگیر جنگ بھی ایک طرح سے اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ساری دنیا کے کالونیل ممالک میں قومی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ وہ سامراجی نظام کی جکڑ بندی سے اپنے کو آزاد کرانے میں لگے ہوئے تھے۔ سرمایہ داری کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ اس حیثیت سے یہ سارے بیرونی اثرات یا "خارجی ماحول" اس کی شاعری کے اندرونی یعنی "معنوی دنیا" کی تربیت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس کی "معنوی شخصیت" کا سراغ لگانا خارجی ماحول کی روشنی میں بڑا آسان ہو جاتا ہے مجاز کی شاعری "گلدستہ معنی کا طلسم" تو ہے نہیں کہ اس کو سمجھنے میں دقت ہو۔ اس کی شاعری سیدھی سادی جذبہ، احساس اور وجدان کی شاعری ہے۔ وہ ہر آن اپنے دل کا خون کرتا ہوا نظر آتا ہے وہ بھولا بھالا عاشق ہے ہر آن اپنی محبوبہ پر اپنے کو قربان کرنے کے لیے آمادہ ہے۔ لیکن وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ اس کی محبوبہ کو کوئی دوسرا دیکھ سکے۔ خود اپنے ہی دل میں اس کی جلوہ فرمائیاں دیکھنے کا خواہش مند ہے۔

وہ دوسرے رومانی شعراء کی طرح حسن کا شیدائی ہے۔ اسی کو وہ اپنی کائنات سمجھتا ہے وہ اس دنیا کی عورت سے محبت کرتا ہے۔ عورت اس کے نزدیک مجسمہ شعر و نغمہ ہے۔ لذت اندوزی کا ذریعہ ہے جو اس کو سکون اس کے ذریعہ سے ملتا ہے۔ عورت ہی اس کا دین و ایمان ہے۔ عورت ہی اس کی دنیا ہے۔ وہ کبھی اس کو چاند ستاروں کی نیرنگیوں سے آراستہ کرنا اور کبھی سنگیت کو اس کے جسم کے تاروں میں بھرنا چاہتا ہے۔ یہ اشعار ان ساری چیزوں کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں ؎

میں اس کو پوجتا ہوں اور اس کو پا نہیں سکتا ۔۔۔ وہ مجھ کو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی
یہ مجبوری سی مجبوری یہ لاچاری سی لاچاری ۔۔۔ کہ اس کے گیت بھی جی کھول کر میں گا نہیں سکتا
زباں پر بیخودی میں نام اس کا آ ہی جاتا ہے ۔۔۔ اگر پوچھے کوئی یہ کون ہے بتلا نہیں سکتا

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیِ کرم فرما بھی گئے
اس سعیِ کرم کو کیا کہئے بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

رودادِ غمِ الفت ان سے ہم کیا کہتے کیونکر کہتے
اک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے

کمالِ عشق ہے دیوانہ ہوگیا ہوں میں یہ کس کے ہاتھ سے دامن چھڑا رہا ہوں میں

وہ آ بھی جاتے، وہ ہو بھی جاتے چشمِ تمنا پھر بھی ترستی

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا، اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے، وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

بتاؤں کیا تجھے اے ہمنشیں کس سے محبت ہے
میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے
سراپا رنگ و بو ہے پیکرِ حسن و لطافت ہے
بہشتِ گوش ہوتی ہیں گہر افشانیاں اس کی
وہ میرے آسماں پر اخترِ صبحِ قیامت ہے
ثریا بخت ہے، زہرہ جبیں ہے ماہ طلعت ہے
مرا ایماں ہے، میری زندگی ہے، میری جنت ہے
مری آنکھوں کو خیرہ کر گئیں تابانیاں اس کی

وہ اپنے قلم کی رعنائی سے "ریل" تک کو ایک بانکی حسینہ" بنا دیتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اس کے حواس کو لذت اور اس کے جذبہ کو سرمایۂ مسرت سے مالامال کر دیتی ہے۔

نونہالوں کو سناتی میٹھی میٹھی لوریاں
نازنینوں کو سنہرے خواب دکھلاتی ہوئی

ٹھوکریں کھا کر، لچکتی، گنگناتی، جھومتی
سرخوشی میں گھنگروؤں کی تال پر گاتی ہوئی

ناز سے ہر موڑ پر کھاتی ہوئی سو پیچ و خم
اک دلہن اپنی ادا سے آپ شرماتی ہوئی

مجازؔ کے یہاں دوسرے رومانی شعراء کی طرح راسخ رسوم اور کہنہ اداروں سے بیزاری کا جذبہ اپنی پوری شدت کے ساتھ ملتا ہے۔ وہ مذہب کا پابند رہنا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ مذہب نے اس کی نظر میں ہمیشہ سیدھے سادے عوام کا گلا گھونٹا ہے۔ حکمراں طبقہ نے اس کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا ہے۔ مذہبی ادارے اس کے جذبہ کی راہ میں سنگ گراں ہیں۔ وہ بداطوار ہو چکے ہیں۔ وہ انسانیت کو ٹکڑیوں میں بانٹتے ہیں۔ اور اس کو عوام کی آزادی، ان میں مساوات اور خوش حالی کو دیکھنے کی تڑپ ہے ۔۔

کفر و الحاد سے نفرت ہے مجھے اور مذہب سے بھی بیزار ہوں میں

قدامت حد میں کھینچتی ہی رہے گی قدامت کی بنیاد ڈھائے چلا جا

جن چیزوں کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے وہ مجازؔ کی شخصیت کا جزو بن چکی تھیں اور انھیں کی چاندنی ہم کو ان کے اشعار میں بھی نظر آتی ہے۔ جن امثلہ کو ہم نے اوپر پیش کیا ہے۔

ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ قاضی عبدالغفار صاحب مجاز کی شخصیت کے اس پہلو کی طرف کیا خوب اشارہ کرتے ہیں " مجاز ایک شاعر اور ادیب ہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنے مخصوص کردار کی وجہ سے بھی ایک دل چسپ شخصیت رکھتے تھے۔ ان کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ اس حالت میں بھی جبکہ ان کی عمر کا بڑا حصہ انتہائی افلاس اور تنگ دستی کا مقابلہ کرتے گزرا انھوں نے اپنی شان استغنا کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ یہ گذشتہ سال ہی کا واقعہ ہے کہ اس بات کی کوشش کی گئی۔ کہ حکومت ہند ان کے لیے کوئی امدادی وظیفہ مقرر کر دے اور اس کوشش میں کامیابی کی پوری امید تھی۔ درخواست کا فارم دوستوں کے پاس پڑا رہا اور اس بندۂ خدا نے اتنی پروا بھی نہ کی کہ اس پر دستخط کر دیتا۔ وہ ہمیشہ دولت اور ثروت کی نمود و نمائش سے بے پروا رہے اور اپنی اسی وضعداری کو سنبھالے ہوئے دنیا سے گذر گئے "۔ (خطبۂ صدارت) کل ہند سالانہ مشاعرہ۔ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین، علی گڑھ، منعقدہ ۱۴ / دسمبر ۱۹۵۵ء)

مجاز سرمایہ داری نظام کی حقیقت کو بھی کما حقہٗ جانتا ہے۔ اس کو خبر ہے کہ ہمیشہ اس نے مزدوروں اور کسانوں کا خون چوسا ہے ان کے گلے میں طوق و سلاسل ڈالے ہیں۔ ان کو اپنا بے دام کا غلام بنایا ہے۔ اپنا پیٹ بھرا ہے اپنے کو آسودہ کیا ہے۔ وہ ایک رومانی شاعر کی طرح اس جکڑ بند کو غیر ضروری اور مہلک گردانتا ہے۔ وہ مزدوروں اور کسانوں کو خوش، مسرور اور آسودہ دیکھنے کا خواہش مند ہے۔ سرمایہ داری کے خلاف اس کی آواز میں بلا کی گھن گرج ہے، ایک صاعقہ بردوش انقلابیت ہے۔ ایک کڑک ہے۔ ایک تڑپ ہے کرب اور بے چینی ہے۔ سرمایہ داری کے متعلق کیا خوب کہتا ہے ؎

یہ وہ آندھی ہے جس کی رو میں مفلس کا نشیمن ہے
یہ وہ بجلی ہے جس کی زد میں ہر دہقاں کا خرمن ہے
یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہے
مگر مزدور کے تن سے لہو تک چوس لیتی ہے

یہ انسانی بلاخود خون انسانی کی گاہک ہے
وبا سے بڑھکے مہلک، موت سے بڑھ کر بھیانک ہے

مجاز کے یہاں اعلیٰ سنجیدگی جو بڑے بڑے شاعروں کا طرۂ امتیاز رہی ہے نہیں ملتی اس کے یہاں "مقدس سنجیدگی"، شائستگی، لہجہ کی نرمی، خیال کی پاکیزگی اور شاعری و شرافت کا جیتا جاگتا توازن نہیں ملتا۔

اس کا جسم، جذبہ اور ذہن تینوں ایسے ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر ثابت و سالم اور صحت مند نہیں ہیں ان میں آپس کی کھینچ تان ملتی ہے۔ وہ اپنی اپنی جگہ پر قابض اور متصرف نہیں ہیں۔ وہ ہم کو ہر آن بچوں کے مانند بھولا اور بے تکلف نظر آتا ہے۔ اور جا بجا کھل کھیلتا ہوا ملتا ہے۔ اس کے یہاں "دل و دماغ" کا وہ توازن جو غالب اور فیض کے یہاں ملتا ہے مفقود ہے۔ یہی کچھ چیزیں ہیں جنھوں نے اس کو ایک CLASSICAL شاعر ہونے سے باز رکھا۔

علاوہ ازیں مجاز وہ گہری بصیرت بھی نہیں رکھتا جو "قطرہ" میں "دریا" اور "جز" میں "کل" کو خود دیکھنے اور دوسروں کو دکھانے پر مجبور کرتی ہے اس کے یہاں معمولی درجہ کا "مشاہدہ" اور معمولی درجہ کا "مجاہدہ" ملتا ہے۔ اور وہ فیض کے اس معیار پر پورا نہیں اترتا "یوں کہئے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے، گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے، اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤں میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر ہے (دستِ صبا۔ ابتدائیہ۔ صفحہ ۸)

ہماری یہ رائے دوسروں کو تھوڑی گراں ضرور گزرے گی لیکن ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ مجاز کے یہاں اس درجہ کی پیکر تراشی، خلاقی، صورت گری، موزونیت، خد و خال کی دلاویزی بھی نہیں ملتی جو بڑے بڑے شعراء کے یہاں ملتی ہے۔ وہ فکر و نظر کے بدلتے ہوئے محوروں کو آئینہ بھی ٹھیک طرح پر نہیں دکھا سکتا۔ لیکن اس کے کلام کی تازگی اور توانائی سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا اور قاضی عبدالغفار صاحب کی زبان میں "اس کی شاعری کے جواہر ریزوں" کی عظمت سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

راہی معصوم رضا

دیوانہ مرگیا

آج بے چین ہے کیوں گنج کی شاموں کا طلسم
ہر طرف جیسے اندھیرا ہے یہ کیا قصہ ہے
کیوں پریشان نظر آتی ہے کافی کی مہک
ایک دیوانہ نہیں آیا تو سنّاٹا ہے

پیالیاں آج کھنکنے سے بھی کتراتی ہیں
آس تحلیل ہوئی جاتی ہے مایوسی میں
قہقہے اوڑھ کے بیٹھے ہیں اداسی کی ردا
نغمے ڈوبے ہی چلے جاتے ہیں خاموشی میں

دل کے سرگم کا ہر اک بول ہے اک قطرۂ اشک
چپ ہیں بربط کے نئے اور پرانے سبھی تار
ہم بھی آواز دیں اس نغمۂ آوارہ کو
زندگی تجھ میں بھی جرأت ہو تو چل اس کو پکار

سن رہا ہوں کہ مجاز آج نہیں آئے ہیں
کاش یہ ایک لطیفہ کے سوا کچھ بھی نہ ہو
لکھنؤ تو ہی بتا کیسا تھا بیمار ترا
دوستو آج ہنسو اور ہنسو اور ہنسو

آخر اس رند بلا نوش نے توبہ کر لی
جوشؔ صاحب کی نصیحت نے بڑا کام کیا
آج پھر ٹوٹ گیا شامِ اودھ کا جادو
اک مسافر نے سرِ راہ پھر آرام کیا

اے "گداز دل محروم" خبر ہے کہ نہیں
راہ ویران ہے تیرا وہ مسافر نہ رہا
بول بیباکیِ عشقِ دلِ شاعر کچھ بول
جس کے ہر لفظ میں جادو تھا وہ ساحر نہ رہا

اتنے ہونٹوں کی ہنسی ساتھ گئی ہے اس کے
موت بھی سوچ رہی ہوگی کہ یہ کون آیا
میرے یا اس کے کسی دوست کے دامن سے الگ
کیا پتہ کتنوں کے دامن میں لہو ٹپکا ہے

کوئی زنجیر نہ بہلا سکی دیوانے کو
سینۂ موسمِ گل تیرے لئے اور اک داغ
"شہر کی راتو"! وہ "آوارہ" کہاں ہے آخر
"جگمگاتی ہوئی سڑکو"! کوئی ہلکا سا سراغ

یا تو وہ رند چھپا ہے کسی "میخانے" میں
یا وہ ہوگا "کسی شہناز کے کاشانے" میں
اور اگر یہ بھی نہیں ہی تو سن اے وحشت دل
چل اسے ڈھونڈھنے چل اب کسی "ویرانے" میں

کون تھا وہ کہ میری آنکھ ہی نم اس کے لئے
نہ مرا دوست، نہ دشمن، نہ عزیز اور نہ رقیب
اس کو روئیں تو علی گڑھ کی فضائیں روئیں
اس کو رونا ہے تو وہ روئیں جو تھے اسکے قریب

جس کی ہر بات پہ چونک اٹھتی تھیں دیواریں تری
وہ رقیبِ حرم و دیر، وہ دیوانہ گیا
جس کے ہر نقش قدم میں کئی افسانے تھے
اے علی گڑھ کی گذرگاہو وہ افسانہ گیا

کعبۂ شعر و سخن! کیا ہے اب ان کمروں کا حال
جن میں 'اسرار' سے فنکار بنا تھا کوئی
جن میں یہ لہجۂ نو پہلے پہل گونجا تھا
جن میں اک پھولوں کی تلوار بنا تھا کوئی

کس طرح سوچتے ہوں گے وہ در و بام آخر
جن در و بام نے آغازِ جنوں دیکھا تھا
جس تک آتے رہے اور آتے رہیں گے پیاسے
ہم نے اس جام میں پندار کا خوں دیکھا تھا

لوگ ہنستے رہے پیتے رہے چھلکاتے رہے
اب اُسے قبر کی گہرائی میں پھینک آئے ہیں
سوچتا ہوں کہ اسے قتل کیا ہے کس نے
نام کس کس کے بتاؤں کہ جو یاد آئے ہیں

میں بھی کیا، آپ بھی کیا، آپ بھی کیا، آپ بھی کیا
سب نے اس ساز کی رگ رگ سے لہو چوسا ہے
رفتہ رفتہ وہ بکھرتا رہا ہر سانس کے ساتھ
اب بچا کیا ہے نہ مطرب ہے نہ مضراب نہ لَے

ایک پیمانہ تھا جو ٹوٹ گیا ٹوٹ گیا
"اور بازار سے لے آئیں گے" پروا کیا ہے
کوئی مضمون لکھے اور کوئی نظم لکھے
"دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے"

ہو سکے تجھ سے تو اک بار پھر اے نجد مجاز
اٹھ کسی اور کے اب جیب و گریباں کو سنوار
جاگ اے شہر نگار! آج ترا قیس نہیں
اے علی گڑھ کسی دیوانے کو پھر بڑھ کے پکار

دل کے زخموں کو لطیفوں میں چھپانے والے
ختم ہوتا ہے یہ انداز وفا تیرے بعد
"کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا تیرے بعد"

میرا کیا اور مرے اشکوں کی قیمت ہی کیا
"بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا تیرے بعد"
کون بتلائے کہ حیران ہیں کتنے گیسو
کتنے ناخن ہوئے محتاجِ حنا تیرے بعد"

ذہن نے موت کی ہر بات کو جھٹلایا ہے
"یہ ستمگر ترے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا"
اے خود اپنے ہی مذاقِ طرب آگیں کے شکار
"تو نے چاہا تھا کہ مر جائے سو وہ بھی نہ ہوا"

اُردو ادب کا شیلی — اسرار الحق مجاز

کاظم علی خاں

۱۸۲۲ء میں مرنے والے انگریزی ادب کے رومانی شاعر (SHELLEY) شیلی کی ۱۹۵۵ء میں دوبارہ وفات ہوئی ۱۹۵۴ء نے ہم سے اردو ادب کے بہت سے ادیب جدا کئے اور ۱۹۵۵ء نے جاتے جاتے اردو ادب کے SHELLEY شیلی یعنی مجاز کو ہم سے جدا کر دیا۔ وہ مجاز جو شیلی کی طرح "غنائی شاعر" تھا جو شیلی کی طرح سماج کے فرسودہ نظام سے تنگ آچکا تھا۔ جو شیلی ہی کی طرح پرانے رسوم کے قصر ڈھانا چاہتا تھا جو شیلی کی طرح مذہب کے جھوٹے دعویداروں کے چہروں پر سے نقاب ہٹاتے ہوئے ذرا بھی نہ ڈرتا تھا۔ جو شیلی کی ہی طرح عام بنی نوع انسان سے محبت کرتا تھا۔ جو شیلی ہی کی طرح بیمار ہو کر بھی بیمار سماج کا مسیحا تھا وہی مجاز! جو اردو ادب کا رومانی شاعر تھا اب ہم میں نہیں رہا۔ وہ مجاز جس نے منٹو کی موت پر چند ماہ پہلے کہا تھا "اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے" جس نے اپنے متعلق کہا تھا "میری باتوں میں مسیحائی ہے —— لوگ کہتے ہیں کہ بیمار ہوں میں" جسے لوگ آوارہ و مجنوں کہتے تھے۔ جو ایک دیوانہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ جس پر کفر کے فتوے عائد کر دیئے گئے تھے آج ہم سے دور تمام الزامات سے بے نیاز موت کی آغوش میں چین کی نیند سو رہا ہے۔ زندگی کے گیت گانے والے "نوع انسان کے پرستار" کو اب موت کے فرشتہ نے ہمیشہ کے لئے خاموش کر کے نوع انسان سے جدا کر دیا ہے اور ہم اسی کے الفاظ میں اسے اس طرح یاد کرنے پر مجبور ہیں۔ شعر۔

ہندو چلا گیا نہ مسلماں چلا گیا — انساں کی جستجو میں اک انساں چلا گیا

آیئے دیکھیں کہ جس کا غم نہ صرف آپ اور ہم بلکہ سارا اردو ادب کر رہا ہے اس نے اردو ادب کے لئے کیا کیا؟ آخر وہ کون سی خوبیاں ہیں جو ہمیں اس "آوارہ"، "دیوانے" اور "شرابی" کی موت پر آنسو بہانے پر مجبور کر رہی ہیں۔ آیئے غور کریں کہ اس بارہ بنکی کے شاعر نے لکھنؤ میں رہ کر علی گڑھ والوں کے لئے کیا کیا جس کی بنا پر ہم اور آپ بلکہ سب ہی متاثر ہیں اور "علی گڑھ میگزین" نے اس سال اس کو اس قدر اہمیت دی ہے۔

مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دیوان کا جائزہ لے کر اس کے کلام کے ہر پہلو پر الگ الگ روشنی ڈالی جائے اور پرکھا جائے کہ اس کا کلام جو اس کی زندگی کا سرمایہ ہے کس حد تک کھرا اور کس حد تک کھوٹا ہے تاکہ اندازہ لگایا جا سکے کہ وہ کس درجہ کا شاعر تھا۔

سب سے پہلے تو آپ کی توجہ اس کے کلام کے اس پہلو کی طرف مبذول کرانا ہے جس پر "آہنگ" کے دیباچہ میں فیض احمد فیضؔ نے روشنی ڈالی ہے۔ فیضؔ نے مجازؔ کے کلام کے خارجی پہلو پر بحث کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ مجازؔ "بنیادی طور پر طبعاً "غنائی شاعر" تھا وہ ہمیشہ گاتا رہا ہے اس کے نغموں کی نوعیت بدلتی رہی لیکن اس کے آہنگ میں فرق نہ آیا"۔ اور واقعی مجازؔ کے کلام کی یہ صفت اس کے دیوان پر ایک سرسری نظر ڈالنے والے کو بھی نہایت آسانی سے مل جائے گی۔ اسی "غنائیت"، کی بنا پر مجازؔ اردو ادب کا شیلی کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ اس کے شعروں میں روانی ہوتی ہے جو سننے میں بھلی اور پڑھنے میں اچھی معلوم ہوتی ہے یہی "روانی" یا "غنائیت" کبھی "آج کی رات میں"، نظر آتی ہے تو کبھی "رات اور ریل" ریل کی طرح رواں دواں معلوم ہوتی ہے۔ نظم "آج کی رات"، کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے جن میں نغمہ کی سی "غنائیت" بدرجہ اتم موجود ہے۔

۱۔ دیکھنا جذب محبت کا اثر آج کی رات ‏ ‏ ‏ میرے شانوں پہ ہے اس شوخ کا سر آج کی رات

۲۔ نغمہ و مے کا یہ طوفان طرب کیا کہنے ‏ ‏ ‏ گھر مرا بن گیا خیام کا گھر آج کی رات

۳۔ وہ تبسم ہی تبسم کا جمال پیہم ‏ ‏ ‏ وہ محبت ہی محبت کی نظر آج کی رات

۴۔ نور ہی نور ہے کس سمت اٹھاؤں نظریں ‏ ‏ ‏ حسن ہی حسن ہے تا حد نظر آج کی رات

یا نظم "رات اور ریل" کی مسلسل روانی اور غنائی کیفیت سے لطف اندوز ہوئیے۔

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی　　نیم شب کی خامشی میں زیرِ لب گاتی ہوئی
تیز تر ہوتی ہوئی منزل بہ منزل دم بہ دم　　رفتہ رفتہ اپنا اصلی روپ دکھلاتی ہوئی
ٹھوکریں کھا کر، لچکتی گنگناتی جھومتی　　سرخوشی میں گھنگرؤں کے تال پر گاتی ہوئی

بقول فیض "غنایت ایک کیمیاوی عمل ہے جس سے معمولی روزمرہ کے الفاظ عجب پراسرار دلربا معنی صورت اختیار کر لیتے ہیں ——— یہی غنایت مجازؔ کو اپنے دور کے دوسرے شعراء سے ممیز کرتی ہے" اس غنائیت کی وجہ سے "مجازؔ کے شعروں میں تھکن نہیں مستی ہے۔ اداسی نہیں سرخوشی ہے ——— مجاز کی انقلابیت عام انقلابی شاعروں سے مختلف ہے۔ عام انقلابی شاعر انقلاب کے متعلق گرجتے ہیں، للکارتے ہیں، سینہ کوٹتے ہیں انقلاب کے متعلق گا نہیں سکتے۔ وہ صرف انقلاب کی ہولناکی کو دیکھتے ہیں اس کے حسن کو نہیں پہچانتے ——— ان میں انقلاب کی قاہری ہے دلبری نہیں ——— مجازؔ انقلاب کا ڈھنڈھورچی نہیں انقلاب کا مطرب ہے۔

مجازؔ کے کلام کے اس اہم خارجی پہلو کو سمجھنے کے بعد اب ہمیں اس کی شاعری کے داخلی پہلو کی طرف مڑنا چاہئے۔ مجازؔ کے دیوان "آہنگ" کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شروع شروع میں مجازؔ نے بھی دوسرے عام شعراء کی طرح بغیر کسی خاص مقصد کے نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں۔ لیکن ۱۹۳۲ء میں اس کی ایک اہم نظم "ایک دوست کی خوش مذاقی پر" نے ہمیں اس بات کے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ مجاز ان عام شاعروں سے الگ ہو کر ایک خاص راستے پر آگیا ہے جو اسے انگریزی ادب کے رومانی شاعر SHELLEY شیلی (WORDSWORTH) ورڈسورتھ اور (KEATS) کیٹس کی طرف لئے جا رہا ہے۔ اس کی اس نظم میں ان رومانی شاعروں کی سی فطرتی شاعری (NATUR POETRY) کی جھلک نظر آتی ہے۔ اسی راہ پر وہ آگے بڑھ کر بعد میں ان سب سے الگ ہو جاتا ہے اور SHELLEY شیلی کے قریب آجاتا ہے۔ نظم "ایک دوست کی

خوش مذاقی پر،، سے چند اشعار ملاحظہ ہوں

۱۔ ہو نہیں سکتا ترے اس خوش مذاقی کا جواب — شام کا دلکش سماں اور تیرے ہاتھوں میں کتاب

۲۔ رکھ بھی دے اب اس کتاب خشک کو بالائے طاق — اڑ رہا ہے رنگ و بو کی بزم میں تیرا مذاق

۳۔ دیکھ کر یہ شام کے نظارہ ہائے دل نشیں — کیا ترے دل میں ذرا بھی گدگدی ہوتی نہیں

۴۔ حسن فطرت کی لطافت کا جو تو قائل نہیں — میں یہ کہتا ہوں تجھے جینے کا حق حاصل نہیں

اسی مضمون پر شاعر فطرت ورڈسورتھ نے بھی چند اشعار لکھے ہیں وہ بھی فطرت کی رنگینی کے مقابلے میں کتاب کو پھینک دینے کی تلقین کرتا ہے۔

(1) BOOKS 'TIS A DULL AND ENDLESS STRIFE

COME, HEAR THE WOOD - LAND LINNET

HOW SWEET IS HIS MUSIC ON MY LIFE

THERE'S MORE OF WSDOM IN IT,

(2) ONE IMPULSE FROM A VERNAL WUOD

MAY TEACH YOU MORE OF MAN

OF MORAL EVIL AND OF GOOD

THAN ALL THE SAGES CAN.

۱۹۳۳ء کی نظم "رات اور ریل،، کے آخری حصہ میں مجاز کا زاویہ نگاہ ورڈسورتھ سے مختلف ہو جاتا ہے۔ ورڈسورتھ کو فطرت کے نظاروں میں سکون ملتا ہے لیکن مجاز ان میں انقلاب کی سرگرمیاں پاتا ہے اور یہیں سے وہ ورڈسورتھ سے الگ ہو کر شیلی کے قریب آجاتا ہے۔ اب اس کی نظر میں ایک خاص مقصد نظر آتا ہے جس کو پورا کرنے کے لئے اس نے بعد میں واضح طور پر نظمیں لکھیں اور اپنی انھیں نظموں کی بنا پر وہ مشہور ہوا۔ ریل رات کے سناٹے میں رواں ہے۔

۱ - جستجو میں منزل مقصود کی دیوانہ وار	اپنا سر دھنتی فضا میں بال بکھراتی ہوئی
۲ - آگے آگے جستجو آمیز نظریں ڈالتی	شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبراتی ہوئی
۳ - زد میں کوئی چیز آجائے تو اس کو پیس کر	ارتقائے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی
۴ - ایک سرکش فوج کی صورت علم کھولے ہوئے	ایک طوفانی گرج کے ساتھ دراتی ہوئی
۵ - ایک اک حرکت سے انداز بغاوت آشکار	عظمت انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی
۶ - وہ ہوا میں سیکڑوں جنگی دہل بجتے ہوئے	وہ بگل کی جانفزا آواز لہراتی ہوئی
۷ - الغرض اڑتی چلی جاتی ہے بے خوف و خطر	شاعر آتش نفس کا خون کھولاتی ہوئی

اس نظم کے بعد مجازؔ نے ۱۹۳۳ء ہی میں ایک دوسری نظم "انقلاب" لکھکر صاف صاف اعلان کر دیا کہ اس کی شاعری محض شاعری کے لئے نہیں کہ جس سے لطف اندوز تو ہوا جا سکتا ہے لیکن کوئی فائدہ نہیں حاصل ہو سکتا ۔ محبت اور رومان کے گیت گانے والا شاعر اس نظم میں عہد کرتا ہے کہ جب تک اس کا مقصد پورا نہ ہوگا وہ نظموں اور طربیہ شاعری کی طرف نہ رخ کرے گا ۔ اب اس میں ایک ذہنی تبدیلی ہو چلی تھی ۔ یہیں سے مجازؔ نے فریاد کا پہلو بدلنا سیکھا اور آگے بڑھکر اس رجحان میں اس سے بھی زیادہ شدت پیدا ہو گئی مجازؔ نے حکومت سرمایہ دار ۔ مولوی اور یہاں تک کہ خدا بلکہ ہر صاحب امتیاز پر اپنے نقطۂ نگاہ سے سخت سے سخت تنقید کی ہے ۔ یہیں سے اس کو اپنی غلامی کا احساس ہوا اور اس نے ملک کو آزاد کرانے کا عہد کیا انگریزوں کے خلاف آواز اٹھا کر ایسی حکومت کا مطالبہ کیا جو رعایا کی پوری نمائندگی کرے اور ہر شے کی ذمہ دار ہو جائے ملک کی ساری دولت حکومت کی ہو اور حکومت رعایا کی ۔ ملک کے تمام اخراجات کی ذمہ دار حکومت ہو جائے ۔ تاکہ کسی شخص کو زندگی بسر کرنے میں تکلیف نہ ہو ۔ دوسرے الفاظ میں مجازؔ نے روس کے "کارل مارکس" کے نظریہ کو پیش نظر رکھ کر اشتراکیت پر عمل کرنا شروع کر دیا ۔ قانون کی رو سے بچتے ہوئے وہ اپنا خیال عوام میں پھیلانے لگا ۔

۱۹۲۹ء میں جواہرلال نہرو نے لاہور کانگریس کے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں اشتراکیت کی پسندیدگی کا اظہار کیا اور ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ کانگریس کے اجلاس میں اسے عام کرنے کی باقاعدہ کوشش کی۔ اشتراکیت کا اثر نہ صرف روس اور ہندوستان پر پڑا بلکہ ساری دنیا اس سے متاثر ہوئی۔ جرمنی میں ہٹلر کے جبر و استبداد اور فسطائیت نے تمام ملکوں کے اہل علم کو پریشان کردیا جمہوری نظام پر آنچ آتے دیکھکر ۱۹۳۶ء میں دنیا کے تمام نامور علم داں اور علم دوست پیرس میں جمع ہوئے۔ اور فسطائی نظام حکومت کی مخالفت کرکے ادب سے زندگی و سکون کے پہلو پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کو عمل میں لانے کے لئے ایک انجمن ترقی پسند مصنفین بنائی گئی جس کی شاخیں، دنیا کے ہر حصہ میں قائم ہوگئیں۔ سب کا مقصد یہ تھا کہ ادب کو صرف جذبات نگاری اور فن کاری کے لئے نہ وقف کیا جائے بلکہ زندگی کے قریب تر کردیا جائے۔ اور بقول ڈاکٹر اعجاز حسین ادب کے ذریعہ "مزدور، کاشتکار، مفلس، مظلوم کی سرگذشت بیان کرکے دنیا کو ان کا ہمدرد بنایا جائے اور ان کی اہمیت جتا کر ان کو ابھارا جائے تاکہ وہ اپنی حالت درست کرسکیں۔ اسی کے برخلاف سرمایہ داری، توہمات، ظلم، جبر و استبداد، فاشیت، نازیت وغیرہ کے برخلاف نظم و نثر میں مضامین لکھے جائیں ...... ہمارے موجودہ نظم و نثر لکھنے والے اکثر اسی انجمن سے تعلق رکھتے ہیں،، مجازؔ نے بھی اپنی شاعری کا انداز اسی انجمن کے رویہ کے مطابق رکھا۔ اب وہ محض ایک ''رعنائی شاعر،، نہ رہا اس کی گفتار میں جوش و ہمت کی جھلک اور اس کی رفتار میں سپاہیانہ انداز تھا اس کا مذہب خدمت خلق اور ایمان آزادی ہوگیا۔ اس کے دل میں ایک نیا درد پیدا ہوگیا ''جو مزہ لینے کے لئے نہیں رگ عمل میں خون دوڑانے کی خاطر تھا،، اس کے لب و لہجہ میں قنوطیت کے بجائے رجائیت نظر آنے لگی۔ اس نے اس طبقہ کی طرف رخ کردیا جسے افلاس نے کسان اور مزدور کا لقب دیا تھا۔ اس کی شاعری نے اس طبقہ کی طرف ہر ایک کی نظر التفات موڑ دی

مجاز کی شاعری میں ایک خاص اعتماد نظر آنے لگا۔ اس کا مقصد ہندوستانیوں کو احساس کمتری اور بزدلی کے جذبے سے نجات دلا کر جدوجہد کے میدان میں لانا بن گیا۔ اس نے ۱۹۳۳ء میں نظم "انقلاب" لکھ کر اپنے ذہنی ارتقا کی اس نئی منزل میں قدم رکھا جو اسے خالص "ترقی پسند" اشتراکی اور انقلابی شاعر بنا دیتی ہے۔ اس کے لئے مطرب کے پر اثر نغمے قومی کاموں میں رخنہ ڈالتے تھے اس کو موسیقی کی سحر کاری اور اثر سے انکار نہیں تھا لیکن چونکہ یہ سحر کاری اس کے مقصد کی راہ میں رکاوٹ تھی لہذا اس سے وہ اس وقت تک الگ رہنا چاہتا تھا جب تک کہ مقصد نہ حاصل کر لے۔ نظم "انقلاب" کے چند جستہ جستہ اشعار ملاحظہ ہوں

۱ - چھوڑ دے مطرب بس اب للہ پیچھا چھوڑ دے ۔۔۔ کام کا یہ وقت ہے کچھ کام کرنے دے مجھے

۲ - تیری تانوں میں ہے ظالم کس قیامت کا اثر ۔۔۔ بجلیاں سی گر رہی ہیں خرمن ادراک پر

۳ - یہ خیال آتا ہے رہ رہ کر دل بیتاب میں ۔۔۔ بہ نہ جاؤں پھر ترے نغمات کے سیلاب میں

۴ - چھوڑ کر آیا ہوں کس مشکل سے میں جام و سبو ۔۔۔ آہ کس دل سے کیا ہے میں نے خونِ آرزو

۵ - میں نے مانا وجد میں دنیا کو لا سکتا ہے تو ۔۔۔ میں نے یہ مانا غم ہستی مٹا سکتا ہے تو

۶ - مجھکو تیرے سحر موسیقی سے کب انکار ہے ۔۔۔ مجھکو تیرے لحن داؤدی سے کب انکار ہے

۷ - بزم ہستی کا مگر کیا رنگ ہے یہ بھی تو دیکھ ۔۔۔ ہر زباں پر اب صلائے جنگ ہے یہ بھی تو دیکھ

۸ - پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب ۔۔۔ اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شور انقلاب

۹ - آ رہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے ۔۔۔ آگ دامن میں چھپائے خون برساتے ہوئے

۱۰ - بڑھ رہے ہیں دیکھ وہ مزدور دراتے ہوئے ۔۔۔ اک جنوں انگیز لے میں جانے کیا گاتے ہوئے

۱۱ - ختم ہو جائے گا یہ سرمایہ داری کا نظام ۔۔۔ رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوش انتقام

۱۲ - اس طرح لے گا زمانہ جنگ کا خونیں سبق ۔۔۔ آسماں پر خاک ہوگی فرش پر رنگ شفق

۱۳ - اور اسی رنگ شفق میں باہزاراں آب و تاب
جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

اس نظم کے علاوہ بھی وہ مطرب اور طربیہ شاعری سے بیزار نظر آتا ہے۔ ذیل میں اس کی مختلف نظموں اور غزلوں کے اشعار ملاحظہ فرمائیے جن میں مجازؔ نے اپنے ذہن کی اس نئی تبدیلی کی طرف کہیں مبہم اور کہیں واضح طور پر اشارے کئے ہیں۔

۱۹۳۶ء کی ایک نظم "دلّی سے واپسی"، کے آخری شعر میں مجازؔ نے اس کیفیت کو صاف طور پر بیان کیا ہے۔

فطرت دل دشمن نغمہ ہوئی جاتی ہے اب زندگی اک برق اک شعلہ ہوئی جاتی ہے اب

اسی سال کی ایک غزل کا شعر بھی ملاحظہ فرمائیے۔

آہ تو بے اثر تھی برسوں سے نغمہ بھی بے اثر ہے کیا کہئے

۱۹۳۷ء کی ایک نظم "نوجوان سے"، کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے۔

صدائے تیشۂ مزدور ہے ترا نغمہ تو سنگ و خشت سے چنگ و رباب پیدا کر

۱۹۴۰ء کی ایک نظم "گریز" کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے۔

قسم نطق کی شعلہ افشانیوں کی کہ شاعر تو ہوں اب غزل خواں نہیں میں

اور غرض طربیہ شاعری سے الگ رہنے کا ۱۹۳۳ء میں کیا ہوا عہد اس وقت تک مجازؔ نے نہ توڑا جب تک اسے ملک کی آزادی کی قوی امید نہ ہو گئی۔ اور ۱۹۴۵ء میں آخر مجازؔ کو جب ملک کے آزاد ہو جانے کا یقین ہو گیا تو وہی مجازؔ ایک مرتبہ پھر گنگنانے لگا۔ اس نے پھر طربیہ نغمات گانا شروع کر دیئے۔ ۱۹۴۵ء کی ایک نظم "آج"، کا ایک شعر ملاحظہ ہو

پھر مرے لب پر قصیدے ہیں لب و رخسار کے پھر کسی چہرے پہ تابانی سی تابانی ہے آج

لیکن مجازؔ نے انقلابی شاعری اس وقت تک جاری رکھی جب تک کہ ملک میں انقلاب نہ آ گیا۔ کہیں وہ اپنی محبوبہ سے یہ کہتا نظر آتا ہے۔

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

کہیں وہ نوجوانوں سے خطاب کرتا نظر آتا ہے

جلال آتش و برق و سحاب پیدا کر — اجل بھی کانپ اٹھے تو وہ شباب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار پیدا کر — جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

کہیں وہ سرمایہ داری کے خلاف نعرہ بلند کرتا ہے۔

کلیجہ پھنک رہا ہے اور زباں کہنے سے عاری ہے — بتاؤں کیا تمھیں کیا چیز یہ سرمایہ داری ہے
یہ وہ آندھی ہے جس کی زد میں مفلس کا نشیمن ہے — یہ وہ بجلی ہے جسکی زد میں ہر دہقاں کا خرمن ہے
یہ انسانی بلا خود خون انسانی کی گاہک ہے — وبا سے بڑھکے مہلک موت سے بڑھکر بھیانک ہے
کہیں یہ خوں سے فرد مال زر تحریر کرتی ہے — کہیں یہ ہڈیاں چن کر محل تعمیر کرتی ہے
غریبوں کا مقدس خون پی پی کر بہکتی ہے — محل میں ناچتی ہے رقص گاہوں میں تھرکتی ہے
یہ غیرت چھین لیتی ہے حمیت چھین لیتی ہے — یہ انسانوں سے انسانوں کی فطرت چھین لیتی ہے

کہیں وہ شیلی کی طرح سماج کی بندشوں کا شکوہ کرتا نظر آتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے کہ اپنی سنہ ۱۹۳۹ء کی ایک نظم "شکوۂ مختصر" میں وہ کس طرح زمانے کی بندشوں اور فرسودہ نظام کے نقصانات کا شکوہ کرتا ہے۔

مجھے شکوہ نہیں تہذیب کے ان پاسبانوں سے — نہ لینے دی جنھوں نے فطرت شاعر کو انگڑائی
مجھے شکوہ نہیں افتادگان عیش و عشرت سے — وہ جن کو میرے حال زار پر اکثر ہنسی آئی

زمانے کے نظام زنگ آلودہ سے شکوہ ہے
قوانین کہن آئین فرسودہ سے شکوہ ہے

اسی چیز کا شکوہ شیلی نے بھی کس خوبی سے کیا ہے۔ مجاز کی طرح وہ بھی اپنی مشہور نظم (ODE TO THE WEST WIND) میں مضطرب نظر آتا ہے۔

OH! LIFT ME AS A WAVE, A LEAF, A CLOUD

I FALL UPON THE THORNS OF LIFE! I BLEED!

A HEAVY WEIGHT OF HOURS CHAINED AND BOWED

ONE TO LIKE THEE ! LAMELESS, AND SWIFT AND PROUD.

ایک دوسری جگہ شیلی نے پھر کہا ہے -

(1) ALAS! I HAVE NOR HOPE NOR HEALTH

NOR PEACE WITHIN NOR CALM AROUND

NOR THAT CONTENT SURPASSING WEALTH

THE SAGE IN MEDITATION FOUND

(2) NOR FAME, NOR POWER, NOR LOVE NOR LEISURE

OTHERS I SEE WHOM THES SURROUND

SMILING THEY LIVE AND CALL LIFE PLEASURE

TO ME THAT CUP HAS BEEN DEALT IN ANOTHER MEASURE

بالکل شیلی کی طرح مجاز بھی سماج کے خلاف اس وقت آواز اٹھاتا ہے جب اس کی مجبوریاں حد سے گذر جاتی ہیں - جب سماج کی بندشیں اس کو اس کی محبوبہ تک سے نہیں ملنے دیتیں تو وہ انتہائی کرب کے عالم میں بالکل اسی طرح فریاد کرتا ہے جیسے شیلی نے اوپر کے دو بند STANZAS میں کی ہے - اس کی ۱۹۳۶ء کی نظم "مجبوریاں" کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے - مجاز بھی شیلی کی طرح سماج کا ستایا ہوا تھا -

۱ - میں آہیں بھر نہیں سکتا کہ نغمے گا نہیں سکتا — سکوں ہرگز مرے دل کو میسر آ نہیں سکتا

۲ - کوئی نغمے تو کیا اب مجھ سے میرا ساز بھی لیلے — جو گانا چاہتا ہوں آہ وہ میں گا نہیں سکتا

۳ - وہ مجھکو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی — میں اسکو پوجتا ہوں اور اسکو پا نہیں سکتا

۴ - یہ مجبوری سی مجبوری یہ لاچاری سی لاچاری — کہ اسکے گیت بھی جی کھولکر میں گا نہیں سکتا

۵ - کہاں تک قصہ آلام فرقت مختصر یہ ہے — یہاں وہ آ نہیں سکتی وہاں میں جا نہیں سکتا

۶ - حدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے — کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہنچا نہیں سکتا

مجازؔ کے بھی سینہ میں شیلیؔ کی طرح محبت سے بھرپور دھڑکتا ہوا دل تھا۔ اس نے بھی شیلی کی طرح محبوبہ سے وصل کی خواہش ظاہر کرتے ہوئے نہایت عمدہ اور پُر اثر دلائل پیش کئے ہیں۔ شیلی اس سلسلے میں اپنی نظم LOVE'S PHILOSOPHY میں کہتا ہے۔

A FOUNTAIN MINGLE WITH THE RIVER

AND RIVERS WITN THE OCEAN,

THE WINDS OF HEAVEN MIX FOR EVER

WITH A SWEET EMOTION;

NOTHING IN THE WORLD IS SINGLE

ALL THINGS BY A LAW DIVINE

IN ONE ANOTHER'S BEING MINGLE

WHY NOT I WITH THINE?

مجاز بھی بالکل اسی انداز میں اپنی محبوبہ سے وصل کی خواہش ظاہر کرتے ہوئے طرح طرح کے دلائل پیش کرتا ہے۔

اس کی نظم "نذرِ دل" کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ اپنے دل کو دونوں عالم سے اٹھا سکتا ہوں میں — کیا سمجھتی ہو کہ تم کو بھی بھلا سکتا ہوں میں

۲۔ میں قسم کھاتا ہوں اپنے نطق کے اعجاز کی — تم کو بزمِ ماہ و انجم میں بٹھا سکتا ہوں میں

۳۔ تم اگر روٹھو تو اک تم کو منانے کے لئے — گیت گا سکتا ہوں میں آنسو بہا سکتا ہوں میں

۴۔ جذب ہے دل میں مرے دونوں جہاں کا سوز و ساز — بربطِ فطرت کا ہر نغمہ سنا سکتا ہوں میں

۵۔ تم کہ بن سکتی ہو ہر محفل میں فردوسِ نظر — مجھکو یہ دعویٰ کہ ہر محفل پہ چھا سکتا ہوں میں

۶۔ آؤ مل کر انقلابِ تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

آخر میں مضمون کو ختم کرتے ہوئے ہم پھر کہیں گے کہ مجاز اردو ادب کا شیلی تھا۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ سماج کی جھوٹی بندشوں اور فرسودہ نظام کا قصر ڈھا دے کہیں اس نے سرمایہ داری کے منہ پر طمانچہ مارا ہے کہیں وہ خانہ بدوشوں کی زندگی اور ان کے ساتھ سماج کے ناروا سلوک کو برا بھلا کہتا نظر آتا ہے۔ انسانیت کے رشتے اس کو خانہ بدوشوں سے پیارا ہے وہ کہتا ہے۔

یہ کیوں شریک حلقۂ نوع بشر نہیں
انسان ہی تو ہیں یہ کوئی جانور نہیں

یہ "نوع انسانی کا پرستار" واقعی انسانوں سے محبت رکھتا تھا۔ اسی انسانوں کی محبت نے اسے مذہب کے غلط اثر اور مذہب کے جھوٹے ٹھیکیداروں کا مقابلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اپنی مشہور نظم "خواب سحر" میں اس نے مذہب کے غلط اثر کی مذمت کی ہے اس نے مذہب کے ٹھیکیداروں کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ انسان پر مذہب کو ترجیح دی جائے۔ اس کی نظر میں انسان مذہب سے زیادہ اہم ہے۔ وہ مذہب کو انسان کے لئے سمجھتا تھا نہ کہ انسان کو مذہب کے لئے۔ اس کا مذہب انسانیت تھا اور ایمان خدمت خلق۔ "خواب سحر" کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے:۔

۱۔ مہر صدیوں سے چمکتا ہی رہا افلاک پر — رات ہی طاری رہی انسان کے ادراک پر
۲۔ اک نہ اک مذہب کی سعی خام بھی ہوتی رہی — اہل دل پر بارش الہام بھی ہوتی رہی
۳۔ حکمراں دل پر رہے صدیوں تلک اصنام بھی — ابر رحمت بن کے چھایا دہر پر اسلام بھی
۴۔ مسجدوں میں مولوی خطبے سناتے ہی رہے — مندروں میں برہمن اشلوک گاتے ہی رہے
۵۔ آدمی منت کش ارباب عرفاں ہی رہا — درد انسانی مگر محروم درماں ہی رہا
۶۔ اک نہ اک در پر جبین شوق گھستی ہی رہی — آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی
۷۔ رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی — دین کے پردے میں جنگ زرگری جاری رہی

۸ - یہ مسلسل آفتیں یہ یورشیں یہ قتل عام — آدمی کب تک رہے اوہام باطل کا غلام

۹ - ذہن انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں — زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں

۱۰ - کچھ نہیں تو کم سے کم خواب سحر دیکھا تو ہے — جسطرف دیکھا نہ تھا ابتک ! ادھر دیکھا تو ہے

اتنا کچھ لکھنے کے بعد اب مجھے پوری امید ہے کہ آپ کو مجازؔ کی صحیح حیثیت کا اندازہ ہو گیا ہوگا - آخر میں چلتے چلتے آیئے مجازؔ ہی کی زبان سے اس کا تعارف کرایا جائے - جس میں اس نے اپنی ہر صفت کو نہایت ہی مختصر طور پر بڑے پر اثر انداز میں بیان کیا ہے -

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں — جنس الفت کا طلب گار ہوں میں

چھیڑتی ہے جسے مضراب علم — ساز فطرت کا وہی تار ہوں میں

عیب جو حافظؔ و خیامؔ میں تھا — ہاں کچھ اس کا بھی گنہگار ہوں میں

زندگی کیا گناہ آدم ہے — زندگی ہے تو گنہگار ہوں میں

کفر و الحاد سے نفرت ہے مجھے — اور مذہب سے بھی بیزار ہوں میں

میری باتوں میں مسیحائی ہے — لوگ کہتے ہیں کہ بیمار ہوں میں

حور و غلماں کا یہاں ذکر نہیں — نوع انساں کا پرستار ہوں میں

کنور اخلاق محمد خاں

غزل

(نذرِ مجاز)

ایک اک بوند کی خاطر ہوئے رسوا ہم لوگ
ہائے کتنے ہیں خرابِ مئے و مینا ہم لوگ

اور کچھ مل نہ سکا ہم کو اُداسی کے سوا
آرزو تھی کہ بسائیں تری دُنیا ہم لوگ

یہ الگ بات ہے ساقی نے قسم کھائی ہو
توڑ دیتے ہیں اشاروں ہی پہ توبہ ہم لوگ

تشنگی آج گوارا ہے کہیں غیر سے کیا
کوئی اپنا ہو تو کرتے ہیں تقاضا ہم لوگ

بے وفا لاکھ کہیں تجھ کو مگر یہ سچ ہے
آئیں گے پھر ترے کوچے میں دوبارا ہم لوگ

اے کنورؔ آج نہیں بزمِ نگاراں میں مجازؔ
پھر بھی کیا کم ہے علی گڑھ میں ہیں زندہ ہم لوگ

مجازؔ کی شخصیت اور فن
(نقادوں کی نظر میں)

قمر رئیس

ترقی پسند شعراء کی صف میں فیضؔ اور مجازؔ ہی وہ عظیم فنکار ہیں جن کی شاعری کو تمام حلقوں نے خواہ وہ کسی فکر و خیال کے ہوں اپنایا سراہا اور اس کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی۔ بعض بلندپایہ ادیبوں اور ناقدوں نے اپنے مقالوں انتخابوں اور تاریخ ادب میں مجازؔ کی شاعری کو فراخدلی سے جگہ دی اور اس کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا۔ گزشتہ سالوں میں جب اس نے طویل خاموشی اختیار کی تو ہمارے ناقدوں کے قلم بھی کچھ اونگھ سے گئے اور اب جبکہ وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکا ہے، وہی قلم اپنی ساری جولانیوں کے ساتھ بیدار ہو گئے ہیں۔ اب آپ "یادگار نمبروں" میں مجازؔ کی شخصیت اور اس کے فن کے بارے میں بہت کچھ پڑھیں گے اور پڑھتے رہیں گے۔

یہاں میں نے بعض ایسے اہم اور گرانقدر مضامین کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی ہے جو کسی نہ کسی شکل میں مجازؔ کی زندگی ہی میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور جن میں مجاز کی شخصیت اور اس کے فکر و فن کے اساسی پہلو روشن ہو گئے ہیں۔ ہر مضمون کے اہم اور مختلف حصوں کو اس طرح مربوط کرنے کی کوشش کی ہے کہ لکھنے والے ہی کے الفاظ میں مضمون کا خلاصہ ہو جائے لیکن کہیں کہیں ربط و تسلسل قائم رکھنے کے لیے مجھے ایک آدھ الفاظ یا جملوں کا اضافہ بھی کرنا پڑا ہے جس کے لیے صاحب مضمون سے معذرت خواہ ہوں۔

عصمت چغتائی

جب چراغ میں تیل نہیں رہتا تو وہ خاموش ہو جاتا ہے اور جب شاعر یا ادیب گنگ ہو جاتا ہے

تو وہ اللہ کا پیارا ہو جاتا ہے...... تو فی الحال مجاز بھی چل بسے..... غم دل، "وہرا" دل کی وحشتیں

کھسیا گئیں، "طفلی کے خواب" سائے بن کر دھندلے ہوئے اور پھر مٹ گئے۔ اور اس پہ مجھے ایک کہانی یاد آ گئی۔

خاک اور دھول کی دنیا میں ایک پھول نے اپنا مغرور سر بلند کیا اور چمن مہک اُٹھا۔ دیوتاؤں

نے آسمان سے جھک کر اُسے دیکھا اور اُسے چن کر اپنے عظیم الشان باغ میں سجا دیا۔ ادھر سے آئی میٹھی میٹھی

آنکھوں والی پریوں کی شہزادی!

"اے پھول تم کتنے حسین ہو" اس نے کہا اور پھول پنکھڑیاں پھلا کر غبارہ بن گیا۔

"تو مجھے اپنے بالوں میں لگا لو نا" پھول نے کہا۔

"نہیں میرے حسین پھول تم اسی طرح مہکے جاؤ اور میں تمہیں دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتی رہوں گی، ننھی

شہزادی نے اپنی میٹھی آنکھوں میں آنسو چھلکائے۔

"دل چھپا سکتا ہوں میں آنکھیں چھپا سکتا ہوں میں" پھول نے بازو پھیلا دیئے۔

"شاعر اپنا دل اور آنکھیں سمیٹ لو۔ میرے قدم تو اطلس و کمخواب کے عادی ہیں اور میرے جوڑے میں

لگانے کے لیے سونے کا پھول موجود ہے۔"

پھول کی ساری التجائیں بیکار گئیں۔

شہزادی کے جوڑے میں سونے کا پھول سورج جیسی آب و تاب سے جگمگاتا رہا جس کی تمازت

سے اس بیچارے خاکی پھول کی ساری پنکھڑیاں ایک ایک کر کے مرجھا گئیں اور پھر ٹھونٹھ رہ گیا۔

جب دیوتا نے پھول کی اس بدمذاقی کو دیکھا تو بُرا مان گئے وہ اُسے لائے تھے کھلنے اور مہکنے کے لیے

اکتا کر وہ اسے واپس اجڑی ہوئی دھرتی کی گود میں ڈال گئے

مجاز کی زندگی کی طرح ان کی صورت شکل بھی کچھ الجھی الجھی سی ہے۔ تاثرات کی چہرے پر دہ ہماہمی ہے

کہ نقش ونگار کچھ سے کچھ بنکر رہ گئے ہیں۔ آنکھیں تو ہیں مگر یہ اندازہ لگانا ازحد مشکل ہے کہ ان کی تہ میں کیا ڈوبا ہوا ہے۔ ایک مبہم سی یاس و ناامیدی، مگر ساتھ ساتھ کچھ بنانے کا ارمان، کچھ ڈھانے کا حوصلہ، کچھ الجھنیں اور پریشانیاں جو آج کل کے ہر نوجوان کا آبائی حق بن کر چمٹ گئی ہیں۔

اور ایک ناک جو ستواں کی حدود سے کب کی گذر چکی ہے جس کی ہڈی شاہد بڑھ رہی ہے اور چہرہ چھوٹا پڑتا جا رہا ہے اور نہایت ڈرپوک قسم کا سہما ہوا دہانہ جو اپنے مالک کے سریع الحس اور جذباتی ہونے کا علمبردار ہے۔ ناک نقشہ کے حساب سے ہاتھ پیر بھی ہیں پر بال جی بھر کے ملے ہیں جن کے ایک کنارے پر کسی زمانہ میں کھدر کی ایک ٹوپی اس طرح معلق رہا کرتی تھی کہ ہر وقت یہی معلوم ہوتا تھا کہ اب گری اور اب گری۔ اور شاید غریب کہیں گر ہی پڑی۔ اور ہمالیہ سے نکلنے والے سرکش دھارے کی لپیٹ میں آکر بہہ گئی اور اس کی جگہ بالوں والی چائے پوشی سے ملتی جلتی کیپ نے لے لی۔ لیکن وہ بھی کہیں لال پیلی آندھیاں اُڑا لے گئیں۔ اور آج کل جب میں یہ سطریں لکھ رہی ہوں مجاز کے سر پر کوئی شے نہیں سوار ہے جھوٹ سچ کا عذاب راوی کی گردن پر مگر سنتے ہیں کہ اُڑان کے زمانہ میں کہیں ایسے بے موقع پھسل پڑے تھے کہ توبہ بھلی۔ یعنی کہیں بالکل شجر ممنوعہ قسم کی محبوبہ پر پھسل پڑے جو اپنی آبائی مجبوریوں کے باعث عشق کے میدان میں تو اُتر آئی مگر بزنس کے معاملہ میں رہ گئی۔ اور بھئی ہے بھی سچی بات کہ عشق تو اندھا ہوتا ہے پر قاضی اندھے نہیں ہوتے۔ خیر تو نہ جانے کیا بیتی۔ چہرے کی بجھی بجھی چنگاری بتاتی ہے کہ کچھ مزے کی نہیں بیتی۔

مجاز کے یہاں عشق و سیاست باہم سموئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بھلا زندگی میں جب اتنی "مجبوریاں" ہوں تو کوئی کیونکر جیئے۔ ایسی صورت میں

کوئی نغمہ تو کیا اب مجھ سے میرا ساز بھی لے لے

پر ایسا ہوتا تو رونا ہی کاہے کا تھا بھلے ہی دن نہ تھے؟ ساز چھوڑنے پر کون تیار ہے۔ وہی مرغے کی ایک ٹانگ

لوٹ کر واپس چلا جاؤں میری عادت نہیں

پھر یہی مجبوریاں اور لاچاریاں ضدیں بن گئیں۔ چار دن کی ریڈیو کی نوکری ختم ہوگئی منھ پر طمانچہ سا لگا

کیا کہوں کس شوق سے آیا تھا تیری بزم میں
چھوڑ کر خلد علیگڈھ کی ہزاروں محفلیں

مگر چلتے چلتے باز نہیں آتے۔

پھر تری بزم حسیں میں لوٹ کر آؤں گا میں
ایسے ویسے نہیں بڑی دھوم دھام سے
سر سے پا تک ایک خونیں راگ بن کر آؤں گا

مجاز کا عشق کچھ اس بری طرح اس دنیا اور اس کے نظام سے چپکا ہوا ہے۔ کہ وہ اسے جُدا ہی نہیں کر سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کوئی بھی گھر چاندسی دلہن کے پر زور مکھڑے کی دمک سے روشن نہیں ہو سکتا جب تک ملک پر سے یہ بھیانک بیوگی نہ ہٹائی جائے گی۔ ایک ہی سانس میں وہ محبوب کے رخسار کی تابانیوں کے نغمے بھی گاتا ہے اور اُن گھنگور گھٹاؤں کا نوحہ بھی کرتا ہے جو اس کے رُخ روشن پر چھائی ہوئی ہیں۔

ایک چیز جو مجاز کے یہاں پائی جاتی ہے وہ کسی دوسرے شاعر میں اتنی واضح اور اُبھری ہوئی نہیں ہے محبوب اور عورت کا تصور بے حد انوکھا اور اصول شاعری سے ہٹا ہوا ہے۔ پرانی شاعری میں محبوب حسن و جمال کی پوٹ ہوتا تھا۔ اس کے سارے انداز نہایت اجنبی سے معلوم ہوتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آیا معشوق ہی کا ذکر ہے یا کسی جابر اور قہار شہنشاہ کا ذکر ہے جسے عشقیہ غزل میں سمو دیا گیا ہے۔ غرض ان کے یہاں سوائے خوبصورت زبان اور تشبیہات کے انسانی حُسن کہیں نظر نہیں آتا۔ مجاز وہ شاعر ہے جس کی محبوبہ اسی دنیا کی عورت ہے۔

"میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دُنیا کی عورت ہے۔" اس دُنیا کی عورت جسے آپ روز چلتا پھرتا دیکھتے ہیں۔ یہی نہیں مجاز نے عورت کو پہلی بار عورت نہیں کہا بلکہ اُسے نکتہ داں بھی بنا دیا حسن کے ساتھ ساتھ

مجھے حیران کر دیتی ہیں نکتہ دانیاں اُس کی

باوجود کہنہ خیال لوگوں کی چیخ و پکار کے مجاز کے تخیل کی عورت نے دنیا میں قدم رکھ دیا ہے اور بڑھائے چل رہی ہے اور مجاز کی انتجا کہ

سنانیں کھینچ لی ہیں سر پھرے باغی جوانوں نے
تو سامان جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا

خالی نہیں گئی۔ عورت کو بھی احساس ہو رہا ہے کہ۔

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

میں نے مجاز کو بہت قریب سے نہیں دیکھا اور دیکھا بھی صرف تین بار لیکن تینوں بار زندگی کے تین مختلف موڑ پر۔ پہلی بار ۱۹۳۴ء میں یہ مجاز کے عروج کا پر شور زمانہ تھا۔ جب نئی پود نے "آہنگ" کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور سینہ سے لگایا تھا۔ جب مجاز کے نام پر گرلز کالجوں میں لاٹریاں ڈالی جاتی تھیں اور اُس کے اشعار تکیوں کے نیچے چھپا کر آنسوؤں سے سینچے جاتے تھے اور کنواریاں اپنے آئندہ بیٹوں کے نام اسی کے نام پر رکھنے کی قسمیں کھاتی تھیں۔ نہ جانے کس ارمان کے بدلے میں؟ اس ملاقات میں بہت کم کچھ ادھوری سے باتیں ہوئیں۔ مجھے اور صفیہ کو پہونچانے مجاز اور محمود صاحب لال ٹمن لے کر آئے۔ جب پھاٹک کے قریب پہونچے تو مذاق فرمانے لگے۔ "بھئی۔ کسی روز ہمیں بھی مدعو کیجئے" ہم نے کہا بڑے شوق سے مگر سر پر تو ابا ندھ کر آئیے گا۔ چوکیدار کی لاٹھی میں لوہے کی شام لگی ہوئی ہے۔

بولے۔ یہ پہرہ آپ لوگوں پر کب تک رہے گا؟"

"جب تک آپ لوگ چاہیں — میرا مطلب ہے آپ کے قبیلے کے وہ لوگ جو اپنے آپ کو ہمارے چال چلن کا پہرے دار سمجھتے ہیں"

"تو ان سے لڑیئے" مجاز نے کہا

"ابھی نہیں۔ بوقت فرصت انشاء اللہ" ہم نے کہا اور پھاٹک کے اندر غڑاپ ہو گئے۔

اور پھر چار یا پانچ سال گزر گئے کبھی کبھی اڑتی اڑاتی خبریں ملتی رہیں۔ پھر ۱۹۴۴ء میں اچانک ریڈیو اسٹیشن پر ملے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مجاز کا ستارہ شاعری ڈوب چکا تھا۔ کچھ کچھ متقدمین کی طرف کھسکنا شروع کر دیا تھا۔ وہ تو کھو اشاثہ اتنا جمع ہو چکا تھا کہ کچھ نہ کچھ پاؤں جمے رہے ورنہ اگر پشت پر

"آہنگ" نہ ہوتی تو کبھی کے ختم تھے۔ اس ملاقات کے بعد عرصہ تک کوئی خبر نہ ملی اور نہ ہی کچھ زیادہ ڈھونڈی گئی۔ کہ کچھ ماہ ہوئے سُنا کہ منچلے انھیں بمبئی سمیٹ لائے ہیں۔ یہ بھی بُرا نہ ہوا۔ شاید اب بھی بین بٹور کر کام چلایا جا سکے۔ اور اب تیسری دفعہ جب ملی تو دیکھا کہ کچھ صورت ہی دوسری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں طوفان اور ریلے گذر گئے ہیں جو چہرے کے سارے احساسات اور جذبات اُڑا کر لے گئے جیسے نہ یہ شخص کچھ سنتا ہے اور نہ سوچتا ہے اور نہ ہی آئندہ اس قسم کی حماقت کا کوئی ارادہ رکھتا ہے کسی شدید بیماری کے حملے نے بالکل سُن کر ڈالا ہے چہرے کو غور سے دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ شاید اس شخص کو خبر ہی نہیں کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا۔ آنکھوں میں ایک غائرانہ تغافل جیسے کسی کو پہچانتے ہی نہیں۔ . . . . . کھانے والوں کے ساتھ کھا لینا چلتے دیکھ کر چل پڑنا۔ بیٹھے دیکھ کر بیٹھ جانا اور رخصت ہوتے دیکھ کر ان کے پیچھے پیچھے سرک جانا۔ عدم اور وجود کچھ ایک ہی جیسا۔ جسم تو موجود ہے مگر آگے کا سراغ نہیں ملتا کہ دوسرے لوازمات کہاں بھٹک رہے ہیں۔

آج کے مجاز میں اور دس برس پہلے کے مجاز میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ وہ ایک جوشیلا باغی لڑکا تھا اور اب بھٹکتا ہوا جھیلا ہوا مرد ہے۔ وہ ایک دوڑتا اُچھلتا آبشار تھا اور یہ ایک باندھا ہوا دریا دیکھنا ہے یہ بند کب ٹوٹتا ہے۔

لیکن بند ٹوٹنے سے پہلے اُس سرکش دریا کے سوتے ہی خشک ہو گئے۔ اور دسمبر ۱۹۵۵ء میں عصمت کی آخری ملاقات بھی مجاز سے اس وقت ہوئی جب اس کی زندگی کے آخری بلکہ وداعی موڑ کے صرف دو دن باقی تھے۔ ق۔ ر)

فیض احمد فیض

مجاز بنیادی طور پر اور طبعاً غنائی شاعر ہے۔ اس کے کلام میں خطیب کے نطق کی کڑک نہیں باغی کے دل کی آگ نہیں نغمہ سنج کے گلے کا وفور ہے۔ یہی وفور مجاز کے شعر کی سب سے بڑی خوبی ہے اور اس شعر کی کامیابی کا سب سے بڑا امین۔ بیچ کے ایک مختصر سے دور کے علاوہ مجاز ہمیشہ سے گاتا رہا ہے

اسکے نغموں کی نوعیت بدلتی رہی لیکن اس کے آہنگ میں فرق نہ آیا۔ کبھی اس نے آغاز بلاغت کے بھرپور بے فکرانہ خواب نما محبت کے گیت گائے۔

چھلکے تیری آنکھوں سے شراب اور زیادہ

مہکیں تیرے عارض کے گلاب اور زیادہ

اللہ کرے زور شباب اور زیادہ

کبھی اس خواب کی شکست پر آنسو بہائے

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورش دوراں بھول گئے

وہ زلف پریشاں بھول گئے وہ دیدہ گریاں بھول گئے

کبھی اس خالص تخریبی اور مجبور پیچ و تاب کا اظہار کیا جو موجودہ حال کے متعلق ہر نوجوان کا اضطراری اور پہلا جذباتی ردعمل ہوتا ہے

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں

اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں

ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں

اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

کبھی اس تعمیری انقلاب کے اسباب و اظہار کا تجزیہ کیا جسکے نقوش صرف غور و فکر کے بعد دکھائی دیتے ہیں۔

اک نہ اک در پر جبین شوق گھستی ہی رہی — آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی

رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی — دین کے پردہ میں جنگ زرگری جاری رہی

ذہن انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں — زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں

کچھ نہیں تو کم سے کم خواب سحر دیکھا تو ہے — جس طرف دیکھا نہ تھا ابتک ادھر دیکھا تو ہے

یہ کافی متنوع مرکب ہے۔ لیکن اس میں کہیں بھی مجاز کا ترنم بے آہنگ اس کی دھن پھیکی یا اس کے

سر بے سر نہیں ہوئے۔ مجاز کے کلام میں پرانے شعراء کی سہولت اظہار ہے لیکن ان کی جذباتی سطحیت یا محدود خیالی نہیں۔ نئے شعراء کی نزاکت احساس ہے ان کی لفظی کھینچا تانی اور توڑ مروڑ نہیں۔ غنائیت ایک کیمیاوی عمل ہے جس سے معمولی روزمرہ الفاظ عجیب پر اسرار پر معنی صورت اختیار کر لیتے ہیں بعینہ جیسے عنفوان شباب میں سادہ پانی مئے رنگیں دکھائی دیتا ہے۔ مجاز کو اس کیمیاوی عمل پر قدرت ہے۔

ہمدم یہی ہے رہگذر یار خوش خرام
گذرے ہیں لاکھ بار اسی کہکشاں سے

یہی غنائیت مجاز کو اپنے دور کے دوسرے انقلابی اور غنائی شاعروں سے ممیز کرتی ہے۔ عام غنائی شعراء محض عنفوان شباب کے دو چار محدود ذاتی تجربات کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ان تجربات کی تحریک ان کی شدت اور قوت ختم ہو جاتی ہے۔ مجاز کی غنائیت زیادہ وسیع زیادہ گہرے زیادہ مستقل مسائل سے متصل ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں ابھی تک ارتقا کی گنجائش اور پنپنے کا امکان ہے عام نوجوان شعراء کی غنائیت زندگی سے بیزار اور موت سے وابستہ ہے مجاز گرم زندگی کے نغمہ سے چور اور موت کے سرد جمود سے سراسر بیزار ہے۔

مجھے پینے دے پینے دے کہ تیرے جام لعلیں میں
ابھی کچھ اور ہے کچھ اور ہے کچھ اور ہے ساقی

یہی وجہ ہے کہ مجاز کے شعر میں تھکن نہیں مستی ہے۔ اداسی نہیں سرجوشی ہے مجاز کی انقلابیت عام انقلابی شاعروں سے مختلف ہے۔ انقلابی شاعر انقلاب کے متعلق گرجتے ہیں للکارتے ہیں سینہ کوٹتے ہیں۔ انقلاب کے متعلق گا نہیں سکتے عام انکے ذہن میں انقلاب کا تصور طوفان برق و رعد سے مرکب ہے۔ نغمہ ہزار اور رنگینی بہار سے عبارت نہیں وہ صرف انقلاب کی ہولناکیوں کو دیکھتے ہیں اس کے حسن کو نہیں پہچانتے۔ یہ انقلاب کا ترقی پسند نہیں رجعت پسند تصور ہے۔ یہ برق و رعد مجاز پر بھی گذر چکا ہے۔ لیکن اب مجاز کی غنائیت اسے اپنا چکی ہے میں سمجھتا ہوں کہ مجاز کی "خواب سحر" اور "نوجوان خاتون سے خطاب" اس دور کی سب سے مکمل اور سب سے کامیاب ترقی پسند نظموں میں سے ہیں مجاز انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں انقلاب کا مطرب ہے اس کے

نغمہ میں برسات کے دن کی سی سکون بخش خنکی اور بہار کی رات کی سی گرم جوش تاثر آفرینی۔

کلیم الدین احمد

"آہنگ" میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ ان غزلوں میں وہی بے ربطی اور پراگندگی ہے جو صنفِ غزل کا مخصوص نقص ہے۔ مجازؔ کی غزلوں میں نو خیز ناپائیدار اور خام تجربات ہیں جو کچھ بھی قدر و قیمت نہیں رکھتے جن میں کوئی انفرادی شان نہیں۔

مجازؔ کے کلام میں رومانیت کا غلبہ ہے۔ رومانیت کی خوبیاں کم اور نقائص زیادہ ہیں اسی رومانیت کا نتیجہ "رات اور ریل"، جیسی نظمیں ہیں نورا" میں جذبات سچے ہیں۔ فطری رومانیت نے ایک معمولی نرس کو حور حسین بنا دیا نظم کے دوسرے حصہ کے لب و لہجہ سے صاف نمایاں ہے کہ محض ایک معمولی شرارت کا ذکر ہے کسی عمیق اور قیمتی تجربہ کا بیان نہیں۔ ذہنیت و جذبات کا معیار یہ ہے۔

ذرا بڑھ کے کچھ اور گردن جھکا لی
لب لعل افشاں سے اک شے چرا لی

اس قسم کے معمولی رکیک سطحی خام جذبے موضوع شاعری نہیں ہوتے "رات اور ریل" میں بھی مجازؔ کسی خاص تجربہ کا اظہار نہیں کرتے۔ وہ عالم خیال میں ریل کے ہمسفر ہیں۔ ریل کے سفر کو بیان کرتے ہیں لیکن ریل کو طاقت گویائی عطا نہیں کرتے۔ طبیعت کی رومانیت کی وجہ سے وہ ریل کا صحیح نقشہ نہیں اُتار سکتے جو تشبیہیں وہ استعمال کرتے ہیں جو نقوش وہ پیش کرتے ہیں وہ بے موقع و مہمل ہیں۔ دلہن، شاہی برات۔ شادیانوں کی صدا، ان سے اور ریل سے کوئی واسطہ نہیں نظم میں نقوش اور استعاروں کی فراوانی ہے۔ لیکن یہ نقوش بے موقع ہی نہیں ان کے مفہوم کو بھی مجازؔ صاف طور پر ذہن نشین نہیں کرتے۔ نظم "انقلاب" میں کہتے ہیں

چھوڑ دے مطرب بس اب للہ پیچھا چھوڑ دے
کام کا یہ وقت ہے کچھ کام کرنے دے مجھے

عزم لائق تحسین ہے۔ لیکن اس کا تشفی بخش نتیجہ نظر نہیں آتا۔ کام کرنے کے بدلے وہ انقلاب کا

خونی منظر پیش کرتے ہیں۔ ایسا منظر جس سے ادراک کی کمی اور وحشیانہ طبیعت کا پتہ چلتا ہے اسی طرح نظم "سرمایہ داری" فنی اعتبار سے محض قافیہ پیمائی کی ایک مثال ہے مجاز کی انقلابی نظموں میں دو نظمیں قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان کے متعلق بھی صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ "انقلاب" اور "سرمایہ داری" سے کچھ مبتذل ہیں۔ ان نظموں میں مجاز خطیبانہ انداز سے کنارہ کشی کرتے ہیں لیکن بند کے انتخاب نے قافیہ پیمائی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ مکمل نظم میں ارتقائے خیال بھی نہیں۔

مجاز کی ذہنیت ایک طالب علم کی سی ہے جس نے ابھی بی اے نہیں کیا ہے ادراک معمولی اور سطحی ہے۔ جذبات کے اعتبار سے مجاز ابھی اس میدان میں ہیں جس میں ہر نوجوان طفلی کی منزلیں طے کر کے پہلی مرتبہ قدم رکھتا ہے۔ ہاں الفاظ پر البتہ قدرت ہے اور طرز ادا میں روانی و شگفتگی ہے۔ مجاز کو الفاظ سے خاص دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ متنوع الفاظ جمع کر کے یہ اپنی نظموں کو آراستہ کرتے ہیں۔ اسی طرح استعاروں اور نقوش حسین و رعب دار استعاروں اور نقوش کا ہجوم ہے۔ لیکن الفاظ و نقوش کی فراوانی کے سبب سے تجربہ کی شکل صاف ظاہر نہیں ہوتی عموماً تو کسی تجربہ کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ الفاظ و نقوش کی فراوانی غالباً مجاز کی نظموں کی مقبولیت کا سبب ہے۔ ان سے ایک قسم کا ظاہری ادبی رنگ پیدا ہو جاتا ہے اسی سراب کو سب حقیقت سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن سراب سے آسودگی و طمانیت ممکن نہیں۔

ڈاکٹر محمد حسین

ایک مشہور سنگ تراش سے کسی نے پوچھا کہ تم پتھر کی ان جامد اور بھدی سلوں سے اس قدر خوبصورت مجسمے کیوں کر تراش لیتے ہو۔ اس نے جواب میں کہا تھا "میں تو صرف اس قدر کرتا ہوں کہ پتھر سے اس کا زائد اور غیر ضروری جزو تراش کر علیحدہ کر دیتا ہوں اور نقش واضح ہو جاتے ہیں" "آہنگ" ایسے ہی نقوش کا مجموعہ ہے۔ یہ خواب سنگین جو کبھی شباب خوگر آلام کی صورت میں جھلکتا ہے اور کبھی بزم دلبراں ہزار رنگ تصویروں کی آب و تاب بنتا ہے، ہزارہا محرومیوں اور کامرانیوں کے غیر ضروری اجزا علیحدہ کر کے ترتیب دیا گیا ہے محرومیاں اور کامرانیاں مجاز کی داخلی آرزومندی ہی کا عکس نہیں ہیں بلکہ ہمارے عہد کی آسودگی طلب تشنہ کام وجود کی جذباتی سرگذشت ہیں۔

مجاز عہد جدید کا بت شکن شاعر ہے۔ اس کی شاعری غزل گوئی سے اور غزل گوئی بھی فانی بدایونی کے زیر اثر شروع ہوتی ہے لیکن ان غزلوں میں خود گم ہو جانے کی وہ کیفیت نہیں ہے قنوطی اور یاس کی وہ گہری تاریکی نہیں ہے جو فانی کے کلام میں یا کسی روایتی غزل گو کے کلام میں ملتی ہے۔ ان ابتدائی غزلوں کے اشعار میں کہیں شوخی بھی جھلک اٹھتی ہے۔ کبھی ایک والہانہ لہک اور ایک خارجیت پسند تازگی جو برابر بتاتی ہے کہ یہ غزل گو کا خلوت خانہ نہیں کسی کی جلوہ گہ ناز ہے جہاں ہر لمحہ شمع محفل داغ بھی دیتی ہے اور پھول بھی برساتی ہے۔

فاتحانہ سربلندی کے جذبے ستاروں پر کمند ڈالنے کا حوصلہ اور کہکشاں کو روندڈالنے کی امنگ مجاز کی شاعری کا بنیادی نغمہ ہے۔ زندگی کی اس قدر بے پایاں امنگ سے اردو ادب ناآشنا ہے۔ مجاز کے کلام میں کلبیت اور زندگی سے بیزاری نہیں ملے گی۔ اس کا جذبہ وارفتہ "لٹ کے برباد جہاں ہو کے سبھی کچھ کھو گئے" بھی زیاں کا احساس کرنے پر راضی نہیں۔ وہ زندگی کے درد و غم سے واقف ہے۔ تلخی کام و دہن کی آزمائشوں سے بارہا گذر چکا ہے اور نہ جانے کتنی بار شکست دل کا تماشائی بن چکا ہے۔ پھر بھی اس نے جینے کا حوصلہ نہیں چھوڑا ہے "آج بھی" گویا اسی تاب مقاومت کا رجز ہے۔

میں ہوں مجاز آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں

شاعر محفل وفا، مطرب بزم دلبراں

مجاز کی شاعری عقل کی نہیں عشق کی شاعری ہے حکمت کی نہیں جنون کی بازگشت ہے۔ اور اس جنون کے مظاہر رنگا رنگ ہیں یہ جنون اپنے کو پالینے کا جنون ہے۔ اپنی آرزومندی کی تکمیل کر لینے کا جنون ہے آہستہ آہستہ یہ آرزومندی خارجی حالات سے ٹکرا کر نئی صلابت سے آشنا ہوتی ہے۔ اس کا دائرہ حسن و عشق سے شروع ہوتا ہے اور انقلابی شاعری اور اس کے بعد کائنات کے ایک نئے نظام کے خواب کی صورت میں انجام پذیر ہوتا ہے "آج کی رات" اس نشاطیہ اور معصوم آرزومندی کی بڑی پاکیزہ تصویر ہے

مجاز کے کلام میں حسن و عشق کا بھی ایک نیا تصور ملتا ہے۔ اس میں نہ عیاشی اور تلذذ ہے اور نہ

روایتی شاعری کی تجرید محض - یہ آہنگ مجاز نے بڑی کامیابی سے قائم رکھا ہے — مجاز کی محبوبہ نہ ادار باب نشاط میں ہے نہ سفاک قاتلوں کی صف میں وہ ایک ایسی عورت کے پیکر میں نظر آتی ہے جو نہ لطف محض ہو سکتی ہے اور نہ قہر مسلسل - اسی طرح مجاز کا عشق بھی سادی نہیں ارضی اور حقیقی ہے - مگر جسمانی اور تعیش پسند نہیں - وہ عشق کی کامرانیوں میں بھی "احترام لب و رخسار" سے بیگانہ نہیں ہوتا ہے وہ عشق کی لامحدود تشنہ کامیوں سے آشنا ہے - اس کے زخم کھاتا ہے اس کے پھول چنتا ہے اور داغ سینے سے لگاتا ہے۔

"آوارہ" سے اجتماعیت اور انقلاب کی طرف مجاز کا فکری سفر شروع ہوتا ہے - یہاں گویا داخلی آرزومندی نئی وسعتوں سے آشنا ہوتی ہے - اور "شباب خوگر دار و رسن" نئے راستے تلاش کرتا ہے - ایک رومانوی شاعر پہلی بار واضح طور پر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی دشواریاں انفرادی نہیں سماجی ہیں اور یہ آرزوئیں یہ آسودگی کی تمنا بھی عالمگیر ہے اور اس کے حصول کے راستے بھی کم و بیش یکساں ہیں دھیرے دھیرے یہ منزل واضح ہوتی جاتی ہے یہ شعور اور بھی اجاگر ہونے لگتا ہے - سماجی انقلاب ہماری سیاسی زندگی اور جذباتی آسودگی کے لیے لازمی ہے - اور شاعر کو مطرب و مے سے آگے بڑھ کر "شمشیر بکف" سر میدان آنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی: "ہمارا جھنڈا" "مزدوروں کا گیت" "خواب سحر" "عشرت تنہائی" "دھان" اور واضح ترین شکل میں "آہنگ نو" کی صورت میں آیا - مجاز کی انقلابی شاعری نے اردو شاعری کا لب و لہجہ تبدیل کرنے میں حصہ لیا ہے - اس نے ہمارے نوجوان شاعروں کو سیاسی اور دوسرے خارجی موضوعات پر فکر کرنے پر آمادہ کیا -

مجاز کے کلام میں غم جاناں اور غم دوراں کے حدود و تمیز اور الگ الگ نہیں ہیں - اسی لیے انقلاب کا تصور بھی سو فی صدی خارجی و سیاسی نہیں - وہ آہنگ نو میں بھی نگاران جہاں کے تذکرے کی گنجائش نکال لیتے ہیں - اور "جلاوطن کی واپسی" میں شمشیر کے ساتھ ساز و جام کو فراموش نہیں کرتے اور اس سے یہ بات ایک بار پھر واضح ہو جاتی ہے کہ مجاز کا شعور اجتماعیت میں گم ہونے کے بجائے اسے ایک وسیع تر داخلی جذبہ کے ذریعہ احاطہ کرتا ہے: "اعتراف" "اور فکر" سے مجاز کی شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے - اس عہد میں وہ تابناکی اور جوش نہ سہی مگر ایک گہرا اور دیرپا تفکر ملتا ہے - اس تفکر میں نتیجہ

تک پہونچ جانے کا اطمینان نہیں ہے مگر نئے زمین اور نئے آسمان میں اپنا مقام تلاش کرنے کا ایک متعین جذبہ ہے۔

وقت کے آغوش میں سوئے ہوئے نہ جانے کتنے مجسمے سنوز سنگتراش کے تیشہ کے منتظر ہیں۔

ممتاز حسین

اس میں شبہ نہیں کہ مجاز کا اندازِ نظر رومانوی ہے اور وہ بار بار بزم خوباں سے ناکامیوں کے باعث بھاگ کر انقلاب کی طرف آرہا ہے لیکن اس تمام ردعمل کے پیچھے اس کی رومانیت میں دکھی انسانیت کا درد بھی موجود ہے جس کا اظہار وہ بزم خوباں سے الگ ہو کر بھی کرتا ہے۔ اس نے غم روزگار کو صرف غم عشق ہی سے نہیں پہچانا ہے بلکہ تمدن کے ارتقا اور طبقاتی قدروں کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ "سرمایہ دار" "مزدور" اور "لال جھنڈا"، انھیں جذبات کی ترجمان ہیں۔

عصمت نے اپنے محدود دائرہ فکر کے باعث ان نظموں کی طرف بھولے سے بھی اشارہ نہیں کیا ہے۔ انھوں نے صرف "آوارہ" اور "اندھیری رات کا مسافر" کے طوفانی پس منظر میں اس کی المناک زندگی کا تجزیہ کیا ہے جنھوں نے مجاز کو مزدوروں میں گاتے سنا ہے آج نہیں بلکہ آج سے بہت دنوں پہلے جب کہ اس کے اعصاب تندرست تھے وہ میری رائے سے متفق ہوں گے۔ مجاز ایک شکستہ ساز ہے۔ لیکن اس کے ساز کے بہت سے ایسے تار بکھرے پڑے ہیں کہ جنھیں اکٹھا کیے بغیر ہم اس کی مکمل شخصیت کو نہیں پہچان سکتے ہیں۔ اور یہ کام اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ہم مجاز سے اس کی ذہانت کی سپر نہ چھین لیں۔ وہ اپنی اس سپر کو مدہوشی اور بیخودی میں بھی ساتھ رکھتا ہے۔

یوسف خورشیدی

ماتم مجاز

یہ کیا ہوا کہ ہے خوں باریوں فضائے وطن
یہ بھر رہی ہے دمِ سرد کیوں ہوائے وطن
گھُٹے نہ ساز کے سینے میں کیوں صدائے وطن
کہ ہو رہا ہے کہیں خونِ مدعائے وطن

فغاں یہ اے دلِ بیتاب کیسی آتی ہے
صدائے گریۂ احباب کیسی آتی ہے

خبر یہ ہے کہ ثنا خوانِ کاکل و رخسار
تبسمِ لبِ رنگیں کا وہ قصیدہ نگار
وہ ترجمانِ محبت دلوں کا آئینہ دار
فروغِ لالہ و گل جس کی شاعری پہ نثار

وہ آج جھاڑ کے دامن اٹھا ہے منزل سے
بجھا کے شمعِ محبت چلا ہے محفل سے

ذرا ٹھہر کے یہ ماتم کی دُھن بھی سُن لے مجازؔ
یہ دوستوں کی فغاں ہے کہ وقت کی آواز
ہماری بزم سے جاتا ہے یوں پٹک کر ساز
بھری بہار میں گائے گا کون نغمۂ راز

حدیثِ عشق میں پہلی سی دلکشی کیسی
چراغ اُٹھ گیا محفل سے روشنی کیسی

یہ جانتا تھا کہ ہر شئے یہاں کی ہے سفری
جمالِ لیلئ شب ہو کہ خندۂ سحری!
مگر یہ ہوش نہ تھا ہم کو وائے بے خبری
کہ میکدے میں صراحی جو لاکے تو نے دھری

وہ خالی ہونے سے پہلے ہی ٹوٹ جائے گی
ہماری پیاس پہ یوں موت مسکرائے گی

"مطربِ بزمِ دلبراں"

ڈاکٹر عبادت بریلوی

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم لکھنؤ کے جوبلی کالج میں پڑھتے اور شعر و ادب کی دنیا میں ہنگامے برپا کرتے تھے اسی زمانے میں ایک سال ہم نے بڑے پیمانے پر ایک عظیم الشان مشاعرہ ترتیب دیا تھا۔ مہینوں پہلے سے اس مشاعرے کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ شاعروں میں بھی اسکی دھوم تھی اور سامعین میں بھی اس کے چرچے تھے۔ ہندوستان کے تمام اہم شعرا کو اس میں دعوت دی گئی تھی اور ان کی تعداد اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ نوجوان اور غیر معروف شعرا کو اس میں شریک کرنا مشکل معلوم ہوتا تھا — چنانچہ بڑی بحث و تمحیص کے بعد ہم لوگ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ مشاعرہ صرف اساتذہ تک ہی محدود رہے گا — جب اس کا اعلان ہوا تو مقامی شاعروں میں خاصی کھلبلی مچی بعضے ناراض ہوئے اور سارے شہر میں ہمارے خلاف ہنگامہ برپا کر دیا — لیکن بعضوں نے سعی و سفارش سے اس بات کی کوشش بھی کی کہ کسی طرح انھیں اس مشاعرے میں شریک ہونے کا موقع مل جائے — شاعروں کو عموماً اور نوجوانوں کو خصوصاً اس کا شوق تو ہوتا ہی ہے — نتیجہ یہ ہوا کہ طرح طرح کی سفارشیں ہمارے پاس آنے لگیں — چنانچہ بعض نوجوان شعرا کو مجبوراً اس میں شریک کرنا ہی پڑا۔

جب یہ صورت حال پیدا ہوئی تو میرے ایک ساتھی نے کہا — "بندشیں تو اب ہٹ ہی گئی ہیں — ایک نوجوان شاعر کو میں بھی لاؤں گا۔"

میں نے پوچھا — "کون ہے وہ شاعر —؟"

میرے ساتھی نے جواب دیا "اسرار الحق مجاز!"

میں نے کہا "میں نے تو تمھارے اس شاعر کا نام نہیں سُنا"

وہ کہنے لگا "ہاں یہ نام ابھی غیر معروف ضرور ہے۔ لیکن یہ نوجوان شاعر خوب کہتا ہے کلام سنو گے تو پھڑک اٹھو گے" مجھے کئی بار اس کو سننے کا اتفاق ہوا ہے ــــ ویسے وہ علیگڑھ یونیورسٹی کا طالب علم ہے۔ لیکن آج کل لکھنؤ ہی میں موجود ہے"

اور اس طرح وہ دیر تک جی بھر کے اس کا تعارف کراتا اور تعریفیں کرتا رہا۔

شاعرے کے دن یہ صاحب آئے منحنی، دُبلے پتلے، کمزور سے آدمی ــــ گندمی رنگ چھریرا بدن۔ لمبی سی ناک، چھوٹا سا دہانہ مخمور سی آنکھیں لیکن ان میں ذہانت کی چمک، بڑے بڑے سیاہ چمکیلے بال، سر پر اونچی دیوار کی سفید گاندھی ٹوپی، علی گڈھ کاٹ کا پاجامہ، جسم پر ڈھیلی ڈھالی شیروانی، دیکھنے میں کم سخن اور خاموش، باتیں کم کرتے اور کرتے تو شرما شرما کر، الفاظ آدھے زبان سے نکلتے اور آدھے منہ ہی میں رہ جاتے۔ لیکن ہر بات میں بلا کی ذہانت، ہر فقرے میں شوخی اور شرارت ــــ جس سے ملتے اسے اپنا گرویدہ بنا لیتے۔

وقت سے ذرا پہلے آ گئے تھے۔ اس لیے تھوڑی دیر بڑی ہی دلچسپ گفتگو رہی ــــ اس تھوڑے سے وقت میں نہ جانے کتنے لطیفے ہو گئے ــــ لوگوں نے گھیرا ڈال لیا ــــ جو آتا وہ اس دلچسپ محفل میں شریک ہو جاتا ــ اور اپنے آپ کو اس کی دلچسپیوں میں گم کر دیتا۔

مجازؔ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی!

یوں اس سے قبل انھیں دیکھنے کا اتفاق تو بارہا ہوا تھا۔ خصوصاً گرمیوں کے زمانے میں۔ جب کالج اور اسکولوں میں چھٹیاں ہو جاتی تھیں ــــ کبھی دیکھا امین آباد میں سائیکل پر تیزی کے ساتھ چلے جا رہے ہیں ــــ کبھی دیکھا یکّہ میں بیٹھے ہیں اور حسن گنج اور ڈالی گنج کی سیر کر رہے ہیں ــــ کبھی حضرت گنج میں پیدل گھوم رہے ہیں ــــ لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ مجازؔ ہیں۔ پھر بھی وہ اپنے نستعلیق انداز سے نمایاں نظر آتے تھے۔ اور اسی لیے ہم انھیں نہ جانتے ہوئے بھی

جانتے تھے ۔ ان کی شیروانی اور اونچی دیوار کی ٹیڑھی ٹوپی انھیں نمایاں کر دیتی تھی ۔ اور میں انھیں دیکھ کر یہ ضرور سوچتا تھا کہ آخر یہ شخص کون ہو سکتا ہے ۔ ؟

اس روز جب ان سے ملاقات ہوئی تو اس سوال کا جواب بھی مل گیا !

مشاعرے میں مجازؔ نے اپنا کلام سنایا ۔ ان سے کئی غزلیں اور نظمیں سنانے کی فرمائش کی گئی ۔ کلام میں ایک نیا انداز تھا اور اس نئے انداز کے ساتھ پختگی بھی تھی ۔ پڑھنے کے انداز میں بھی ایک نیا پن تھا ۔ اس زمانے میں جگرؔ صاحب کے ترنم کی دھوم تھی ۔ اکثر نوجوان ترنم سے پڑھنے میں انھیں کی نقل کرنے لگے تھے لیکن مجازؔ کا اپنا ایک انداز تھا ۔ سیدھا سادہ لیکن حد درجہ موثر اور دلآویز!

خوب 'واہ واہ' ہوئی بڑے بڑے اساتذہ نے داد دی ۔ اور اس طرح پہلی بار مجازؔ ہم سے اور ہم مجازؔ سے متعارف ہوئے ۔ اور پھر اس کے بعد ان سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں ۔ وہ علی گڑھ سے لکھنؤ برابر آتے رہتے تھے ۔ جب بھی آتے کسی نہ کسی صورت سے ملاقات ہو ہی جاتی ۔ ان ملاقاتوں میں دلچسپ باتیں ہوتیں ، فقرے کسے جاتے ، لطیفے سنائے جاتے اور سنائے ہی نہیں جاتے تخلیق بھی کئے جاتے ۔ کیونکہ معمولی سی بات کو لطیفہ بنا دینا مجازؔ کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کوئی بات بھی لطیفے سے خالی نہیں ہوتی تھی ۔ لطیفوں کے ساتھ شعر و شاعری کا بھی دور ہوتا ۔ مجازؔ جو کچھ کہتے وہ اپنے مخصوص انداز میں ضرور ہم لوگوں کو سنا دیتے اور اس طرح بعض اوقات گھنٹوں ان دلچسپ صحبتوں کا سلسلہ جاری رہتا ۔

اس وقت تک لکھنؤ میں مجازؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں سے بہت کم لوگ واقف تھے لیکن علی گڑھ میں ان کی شاعری کی دھوم تھی ۔ یونیورسٹی کے لڑکوں سے زیادہ وہ لڑکیوں کے محبوب شاعر تھے ۔ ان کا کلام چھپ چھپ کر رات کی تنہائیوں میں پڑھا جاتا تھا ۔ ان کے اشعار انھیں کی دھن ، انھیں کی لے ، انھیں کے مترنم انداز میں گنگنائے جاتے تھے ۔ اور یہ جذب و شوق اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ وہ ہر لڑکی کے محبوب شاعر تھے اور شادی کے لئے ان کے نام کے قرعے نکالے جاتے تھے ۔ ان کی کتاب "آہنگ" شاید اسی وجہ سے قبل از وقت چھپ گئی اور چھپنے کے بعد

اس کی مقبولیت کا وہ عالم ہوا کہ بیان سے باہر ہے ___ بقول عصمت _ "پتلی سی کتاب ایک روپیہ قیمت ، عیدی بقرعیدی ، نمائش کے پیسوں سے چھ چھ سات سات کاپیاں خرید ڈالیں تحفے ہیں تو آہنگ ، نقد ، ادھار ، عاریتاً غرض سارے بورڈنگ میں آہنگ چل پڑی - جدھر دیکھئے چار لڑکیاں چمن کے کونے میں سر جوڑے کبھی ' اندھیری رات کے مسافر ' کے ساتھ دشت پیمائی کر رہی ہیں تو کبھی ' بربط شکستہ ' کے تار سلجھائے جا رہے ہیں - دو ' نذر دل ' لئے بیٹھی ہیں تو چار ' خانہ بدوش ' کے ساتھ اور چند ' رات اور ریل ' کے ساتھ فرّاٹے بھر رہی ہیں تو کوئی بھولی بھٹکی غمگین کسی یاد میں غرق منہ اوندھائے پڑی ہے _ کسی طرف ' انقلاب ' لایا جا رہا ہے تو کہیں ' عذار ' پر پھٹکاریں پڑ رہی ہیں - غرض دل و دماغ پر کچھ اس انداز سے آہنگ چھائی کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دیا بورڈنگ پر ٹوٹ پڑی ہے" ___

غرض ان دنوں وہ صحیح معنوں میں شاعرِ محفل وفا اور مطربِ بزم دلبراں تھے ___ انھیں خود بھی اس کا احساس تھا بلکہ یہ احساس ان کے لئے قریب قریب ایک ذہنی اُلجھن کی حد تک پہنچ گیا تھا - بہرحال اس زمانے میں وہ اپنے آپ کو ہیرو سمجھتے اور اس خیال پر پھولے نہیں سماتے تھے ۔

مجازؔ بے حد شرمیلے آدمی تھے - میں نے کسی سے انھیں آنکھ ملا کر بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا - ان کی آنکھیں ہمیشہ نیچی ہی رہتی تھیں لیکن اس شرمیلے پن کے باوجود ' بزم دلبراں ' سے انھیں گہری دلچسپی تھی _ "نگاران لکھنؤ" اور "عشوہ کاران علی گڑھ" کا ذکر ان کا محبوب مشغلہ تھا - لیکن یہ ذکر بھی وہ کبھی کھُل کر نہ کر سکے - یہ باتیں بھی بلیغ اشاروں ، معنی خیز فقروں اور ذہانت سے بھرپور لطیفوں میں ہوتی تھیں - البتہ زندگی کے اس میدان میں بھی ان سے کچھ نہ ہو سکا - ان کی یہ دلچسپی حقیقی سے کہیں زیادہ رومانی اور عملی سے کہیں زیادہ تخیلی تھی - صنفِ لطیف پر یوں تو وہ جان چھڑکتے تھے لیکن اگر عورت سامنے آجائے تو ان پر گھبراہٹ سی طاری ہو جاتی تھی - اور وہ سب کچھ بھولنے سے لگتے تھے - ایسے مواقع پر خود ان کا وجود تک خطرے میں پڑ جاتا تھا ___ لیکن اس کے باوجود انھیں مطربِ بزم دلبراں ' بننے کی آرزو تھی - اور شاید یہی آرزو تھی جو انھیں علی گڑھ میں میرس روڈ کے چکّر لگانے ، لکھنؤ میں حضرت گنج اور امین آباد کا طواف کرنے اور دلّی میں کناٹ پلیس اور چاندنی چوک کی سڑکیں ناپنے کے لئے

مجبور کرتی تھی - چنانچہ گھومنا اور سیر کرنا ان کے مزاج کا جزو بن گیا تھا - کبھی دیکھا تیزی سے سائیکل پر چلے جارہے ہیں - کبھی دیکھا جھومتے جھامتے اکیلے ہی رواں دواں ہیں - کسی مقصد سے باہر نکلنا تو وہ جانتے ہی نہیں تھے -

جب بھی پوچھا - "کہو بھئی کدھر کا ارادہ ہے" ؟

جواب ملا - "یونہی AT RANDOM نکلے ہیں"

اور واقعی وہ ہمیشہ بس یونہی AT RANDOM نکلتے تھے - مقصد کوئی نہیں ہوتا تھا سوائے اس کے کہ سیر کی جائے، نظارہ کیا جائے - بزم دلبراں نہ ہو تو وہ حسن رہگذر ہی سے محظوظ ہو لیتے تھے - یہی ان کی دنیا تھی - اس سے آگے بڑھنا انھیں نہیں آتا تھا - انھوں نے اس سلسلے میں کارہائے نمایاں نہیں کئے - دور سے دلچسپی لینا اور محظوظ ہونا ان کا شعار تھا - اِس صورت حال نے ان کی زندگی میں محرومی کے احساس کو بہت نمایاں کیا - اس میں شک نہیں کہ سر سے پاؤں تک وہ اسی محرومی کی ایک تصویر تھے - لیکن اس محرومی نے اِن کے یہاں آتشِ شوق کو تیز سے تیز تر کر دیا تھا - وہ گرجتے بہت تھے لیکن گرجنے والے بادلوں کی طرح انھیں برسنا نہیں آتا تھا - 'نگارانِ لکھنؤ' اور 'عشوہ کارانِ علیگڈھ' ان کی اس کمزوری سے خوب واقف تھے - چنانچہ اس سلسلے میں ان سے خاصی چھیڑ چھاڑ بھی جاری رہتی تھی اور اس چھیڑ چھاڑ میں خاصے تغزل کا احساس ہوتا تھا -

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آیا !

ایک دن مجاز یونیورسٹی میں آئے اور ہم لوگوں کو دیکھتے ہی کہنے لگے - "غضب ہو گیا"

میں نے کہا - "خیر تو ہے - کیا کوئی تازہ گل کھلایا جناب نے !"

کہنے لگے - "بس نہ پوچھو ـــ موجِ خون سر سے گزر گئی"

میں نے کہا - "آخر ہوا کیا ؟"

بولے - "کل مطرب، بزم دلبراں واقعی بزم دلبراں میں پھنس گیا"

میں نے کہا "مبارک ہو ! یہ تو خوشی کی بات ہے - مُنہ مانگی مراد بر آئی - لیکن اس میں

پھنس جانے کی کیا بات ہے؟"

کہنے لگے۔" واقعی پھنس گئے تھے یار! بڑی مشکل سے چھوٹے ہیں۔"

میں نے کہا۔" چلو خیریت گذری۔ لیکن آخر معاملہ کیا تھا؟"

کہنے لگے۔" معاملہ کیا تھا۔ کل آئی، ٹی کالج (لکھنؤ یونیورسٹی کا گرلز کالج) میں ایک جلسہ تھا۔ اس جلسے میں مجھے کچھ لڑکیاں پکڑ لے گئیں اور وہاں لے جا کر میری وہ گت بنائی کہ بس کچھ کہنے کو نہیں۔ طے یہ پایا کہ صرف ہم سے کلام سنا جائے گا ـــــ خیر کلام تو ہم نے سنایا لیکن اس پر وہ فقرے بازیاں ہوئی ہیں انھوں نے اپنے تو چھکے چھڑا دئے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ پھر ہم اپنا کلام اپنے ہی انداز میں لڑکیوں کی زبانی سننے لگے ـــــ اور یہ کلام کا سنانا کیا تھا ـــــ اچھا خاصا کیریکچر بنانا مقصود تھا۔ مردوں میں ہم اکیلے تھے۔ بس نہ پوچھو کہ کیا گذری۔"

اور اس طرح دیر تک وہ اس داستانِ رنگین کو فردوس گوش بنا کر سناتے رہے۔ ہم سب نے اس سے خوب لطف لیا اور ہفتوں یہ واقعہ یونیورسٹی میں موضوع گفتگو بنا رہا۔

یہ تو خیر ایک واقعہ تھا۔ مجاز کی زندگی میں اس طرح کے ان گنت واقعات ہیں جن سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں مطربِ دلبراں تھے اور ایک زمانے میں تو لڑکیاں ان پر جان چھڑکتی تھیں اور اس کا اظہار اس طرح ہوتا تھا کہ وہ بے چارے حیران و پریشان رہ جاتے تھے۔ لیکن اس میں ان کے لئے دلچسپی کا بڑا سامان تھا ـــــــــــــ اور یہ دلچسپی انھیں بعض اوقات اپنے حدود سے باہر بھی لے جاتی تھی۔

مجاز ایسے کچھ خوبصورت آدمی نہیں تھے لیکن ان کی شخصیت میں بلا کی دلکشی تھی اور اس لئے وہ سب کے محبوب تھے۔ ان کی معصومیت لوگوں کو سب سے زیادہ متاثر کرتی تھی۔ بھولا پن سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔ اور اس معصومیت اور بھولے پن کے ساتھ ساتھ ان کی لطیفہ سنجی اور فقرہ تراشی تھی جو ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی۔

یہ بات ایسی کچھ عجیب نہیں ہے کہ مجاز نے ساری زندگی کچھ بھی نہیں کیا۔ نہ سنجیدگی سے

پڑھا لکھا — نہ باقاعدگی سے کوئی ملازمت کی۔ اور نہ کسی اور کام کی طرف صحیح طور پر متوجہ ہوئے — مجاز کی طبیعت میں ایک لاابالی پن تھا — ایک ایسا لاابالی پن جو رومانی مزاج کی گھٹی میں پڑا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجاز کے لیے سنجیدگی سے کچھ کرنا تو درکنار کسی ایک جگہ زیادہ دیر تک بیٹھنا بھی ناممکن تھا — اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی متلون مزاجی انھیں کشاں کشاں لیے پھرتی رہی اور کہیں بھی انھیں چین نہ ملا — ان کے جسم میں ایک بے چین اور بے قرار روح تھی جو انھیں کسی کل چین نہ لینے دیتی تھی — اس لیے مجاز نے زندگی میں سوائے شاعری کے کچھ نہ کیا اور ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب وہ شاعری بھی نہ کر سکے اور اس طرح مرنے سے بہت پہلے مر گئے۔

علیگڈھ چھوڑنے کے بعد انھیں ریڈیو میں ایک ملازمت مل گئی تھی اور کچھ عرصے دلّی میں رہے بھی تھے لیکن ملازمت کرنے کے بجائے وہ تفریح کرتے تھے — کام میں ان کا جی نہیں لگتا تھا — کسی کو وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ کسی کے ماتحت رہنے سے انھیں چڑ تھی۔ اس لیے وہ زیادہ عرصے ریڈیو میں نہ چل سکے اور بالآخر انھیں اس سے کنارہ کشی ہی اختیار کرنا پڑی — اور اس کے بعد ان کا بیشتر وقت بیکاری ہی میں گزرا — کچھ عرصے کے لیے دلّی کی ہارڈنگ لائبریری میں انھیں جگہ ضرور مل گئی تھی لیکن لائبریری کی ملازمت بھی ان کے بس کی بات نہیں تھی چنانچہ کچھ عرصے کے بعد اس ملازمت کو بھی وہ خیرباد کہنے کے لیے مجبور ہو گئے — اور پھر دلّی اور لکھنؤ کی سڑکوں پر آوارہ گھومنے کے سوا ان کا کوئی مشغلہ نہیں تھا — اسی عالم میں انھیں مسرت حاصل ہوتی تھی — اور ان کو اس عالم میں دیکھ کر ہمیشہ یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ اسی کام کے لیے بنے ہیں۔ وہ ایک آزاد منش تھے اور انھیں صرف اسی ماحول میں موانست کا احساس ہوتا تھا۔ جہاں کسی قسم کی پابندی نہ ہو — اس لیے ملازمت کے زمانے میں شکوہ و شکایت ہمیشہ ان کا شعار بن جاتا تھا۔ جو بھی ملتا اس سے کہتے، آج کل ہم پابہ زنجیر ہیں، قیدی ہیں، یہ بھی کیا زندگی ہے — دیکھو انسان کو اس زندگی میں کیا کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔

ایک دن مجھ سے بھی زمانے کی بڑی شکایت کی اور کہا — "دیکھو انسانوں کو کیسے کیسے

جبر سہنے پڑتے ہیں"

میں نے کہا" یہ تو زندگی کا قانون ہے"

بولے" اسی لیے تو ہم اس قانون کو توڑتے ہیں"

میں نے کہا" یہ کوئی اچھی بات نہیں"

کہنے لگے" ہم ترقی پسند ہیں"

اس فقرے پر مجھے ہنسی آگئی۔ میں مجاز سے بحث کیا کرتا۔ وہ سنجیدہ بات کو کسی غیر سنجیدہ بات بلکہ لطیفے پر ختم کر دیتے تھے اور ایسے مواقع پر مجھے ہمیشہ ان پر پیار آجاتا تھا۔

مجاز کی زندگی میں بڑے انتشار کی کیفیت تھی۔ باوجود اپنے سبک اور سڈول ناک نقشے اور نستعلیق انداز کے ان کے چہرے سے پریشانی ٹپکتی تھی۔ ایک کرب کا سا عالم نظر آتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ شخص کسی بڑی تکلیف میں مبتلا ہے ــــ اس کرب کی تاریکی میں کبھی کبھی تیز روشنی کی کرن ضرور پھوٹتی تھی لیکن اس سے تاریکی کا احساس کچھ اور بھی شدید ہو جاتا تھا ــــ مجاز کی باتیں مزہ دیتی تھیں ــ ان پر بے اختیار ہنسی آجاتی تھی لیکن یہ باتیں ان کی شخصیت کے کرب کو کم نہیں کرتی تھیں بلکہ اس میں کچھ فراوانی ہی ہو جاتی تھی اور اُن کے جاننے والے اُن کی باتوں پر ہنسنے والے ان سے محظوظ ہونے والے ہمیشہ یہ محسوس کرتے تھے کہ یہ شخص جو دوسروں کے لئے اتنی مسرتوں کا سامان فراہم کرتا ہے خود ان مسرتوں سے محروم ہے۔ اسکی زندگی میں تو غم ہی غم ہے کرب ہی کرب ہے۔ اور وہ اسی غم اور کرب کا مجسمہ ہے۔

یہ کرب کی سی کیفیت جس کا رنگ مجاز کی زندگی میں اس قدر نمایاں تھا بغیر کسی سبب کے نہیں تھی۔ اس کے پیچھے کئی داستانیں تھیں ــــ مجاز یوں تو گل نغمہ اور پردہ ساز نظر آتے تھے لیکن درحقیقت زندگی کے حالات نے انھیں خود اپنی شکست کی آواز بنا دیا تھا۔ مجاز کی زندگی ایک ناکام زندگی تھی ــ انھوں نے جو کچھ بھی چاہا وہ نہ ہو سکا ــ آرزوؤں اور تمناؤں کے جو رنگ محل انھوں نے تعمیر کرنے چاہے وہ زمین پر آرہے اور اس رنگ محل میں امیدوں کے جو چراغ فروزاں کئے وہ اس طرح بجھے کہ پھر کبھی نہ جل سکے۔ اس صورت حال نے خود مجاز کو ایک شمع کشتہ بنادیا

اور وہ ساری زندگی محفل آرائی کی تمام خصوصیات اپنے اندر رکھنے کے باوجود درخور محفل نہ ہو سکے۔

مجازؔ کو شمع کشتہ بنا کر بجھانے میں تمام تر ان کی زندگی کی ناکامیوں کو دخل تھا۔ یہ ناکامیاں ہمیشہ اُن کے دم کے ساتھ رہیں۔ اور پھر ناکامیوں کا یہ احساس ان کے یہاں اس حد تک بڑھا کہ وہ ہر کام سے گھبرانے لگے ـــــ انھوں نے محبت کی لیکن وہ محبت کے قابل سمجھے جانے کے باوجود اس کے قابل نہ سمجھے گئے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو کچھ چاہا وہ نہ ہو سکا ـــــ ان کی محبت ایک ہنگامہ بن گئی ـــــ اور اس ہنگامے نے خود ان کی زندگی کو ایک ہنگامہ بنا دیا جس سے وہ مرتے دم تک دوچار رہے ـــ اور زیر خاک بھی اس ہنگامے کو ساتھ لے گئے ـــ یہ زندگی کی پہلی ٹھوکر تھی اس کے بعد تو بس وہ ٹھوکریں کھا کھا کر گرتے ہی رہے۔ یہاں تک کہ انھیں اپنے آپ کو سنبھالنا بھی دشوار ہو گیا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ وہ آخر وقت تک اپنے آپ کو نہ سنبھال سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساری زندگی انھوں نے ایک انتشار کے عالم میں کاٹی اور اسی انتشار نے انھیں ساری زندگی رنج و غم کا ایک مجسمہ بنائے رکھا ـــ اور اس رنج و غم کی آگ میں وہ ساری زندگی جل جل کر تڑپتے اور تلملاتے رہے۔

اس صورتِ حال کا یہ اثر تھا کہ وہ زندگی کے شیدائی ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اس کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ ہمیشہ یوں محسوس ہوتا جیسے زندگی ان کی طرف بھاگ رہی ہے، ان کا پیچھا کر رہی ہے اور وہ اس سے بچنے اور اس سے فرار اختیار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یا تو وہ کچھ نہ کرتے اور وقت ضایع کرنے میں پناہ ڈھونڈتے تھے یا پھر شراب کو اپنا مونس و دمساز بنا کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جانا چاہتے تھے ـــــ انھیں خود بھی اس بات کا احساس رہتا تھا کہ وہ کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ صرف وقت ضایع کرنے کے سوا ان کا کوئی مشغلہ نہ تھا ـــ لیکن اگر کوئی دوسرا اس موضوع پر ان سے گفتگو کرے اور اس حقیقت کا احساس دلائے تو وہ ہمیشہ اسے مذاق میں ٹالنے کی کوشش کرتے۔

میں نے کئی بار ان سے اس موضوع پر گفتگو کی لیکن ہمیشہ یوں محسوس ہوا جیسے اس موضوع کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے اور وہ اس سے بچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ایک دن میں نے بہت سنجیدگی سے کہا۔ "انسان کو کچھ نہ کچھ کرنا ضرور چاہیے، ورنہ زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔"

کہنے لگے۔ "زندگی تو یوں بھی اجیرن ہے۔ کرنے نہ کرنے سے کیا ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "نہیں یہ بات نہیں زندگی کو بسر کرنے کے قابل بھی بنایا جا سکتا ہے۔"

مجاز نے کہا۔ "اس کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ زندگی کو بھلا دیا جائے۔"

میں نے کہا۔ "یہ غیر ترقی پسندانہ بات ہے۔"

جب گفتگو اس منزل پر پہنچی تو مجاز نے کہا۔ "چھوڑو یار! ان باتوں میں کیا رکھا ہے آؤ کہیں چلتے ہیں۔ ترقی پسندوں کو گھومنا پھرنا چاہیئے۔ سیر کرنا سب سے بڑی ترقی پسندی ہے۔"

اس قسم کی سنجیدہ گفتگو کا ان کے ساتھ ہمیشہ یہی انجام ہوتا تھا ـــــ اصل بات یہ ہے کہ ان کی زندگی میں مسلسل اور پیہم ناکامیوں نے اس درجہ غم پیدا کر دیا تھا کہ ان کے لئے زندگی میں کوئی کشش باقی نہیں رہی تھی ـــ اور وہ اس غم کو غلط کرتے پھرتے تھے۔ ان کا گھومنا پھرنا، دوستوں سے ملنا، فقرے تراشنا اور لطیفے بنانا ان سب کی محرک یہی صورت حال تھی۔ انھیں کے سہارے وہ غم غلط کرتے تھے۔ اور اس طرح وقت کاٹنے کی صورت نکل آتی تھی ورنہ وقت تو ان سے کاٹے نہیں کٹتا تھا۔

مجاز جب تک زندہ رہے ان کے پاؤں میں چکّر رہا۔ شاید ہی زندگی میں کوئی دن ایسا ہو جب وہ جم کر گھر میں بیٹھے ہوں۔ دن بھر بس اِدھر اُدھر گھومتے ہی رہتے تھے ـــ ابھی دیکھا یونیورسٹی میں کھڑے کچھ لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں ـــ تھوڑی دیر بعد دیکھا حضرت گنج چلے جا رہے ہیں ـــ کافی ہاؤس میں بیٹھے ہیں ـــ امین آباد کا چکّر لگا رہے ہیں ـــ غرض سارا دن اسی طرح گزر جاتا تھا رات گئے وہ گھر پہنچتے تھے ـــ اور وہ بھی اس حال میں کہ انھیں خود اپنی خبر نہیں ہوتی تھی ـــ وہ خود تو خیر گھر کیا پہنچتے تھے پہنچائے جاتے تھے ـــــ اور دوسرے دن صبح کو پھر یہی چکّر

شروع ہو جاتا تھا ـــــــ ان کی طبیعت میں ایک بے چینی تھی۔ ان کے مزاج میں ایک تلوّن تھا ـــــــ وہ چین سے ایک جگہ بیٹھ ہی نہیں سکتے تھے ـــــــ ایک سیمابی کیفیت انھیں نہ جانے کہاں کہاں لیے پھرتی تھی ـــــــ اور یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ وہ مسرتوں سے محروم تھے اور ان کی زندگی میں جو غم تھا وہ ہر گھڑی کچوکے لگاتا رہتا تھا ـــ اس احساس کو کم کرنے ہی کے لیے وہ مارے مارے پھرتے تھے ـــــــ علیگڑھ میں میرس روڈ کے چکّر لگانا ان کا محبوب مشغلہ تھا اور لکھنؤ میں امین آباد، حضرت گنج، یونیورسٹی روڈ، اور فیض آباد روڈ پر چہل قدمی ان کی عادت سی بن گئی تھی ـــــــ کوئی مل جائے تو خیر ورنہ وہ اکیلے ہی اس مشغلے کو جاری رکھتے تھے ـــــــ یوں تو ان کا یہ مشغلہ بے مقصد تھا۔ لیکن انھیں دیکھ کر یہ بات محسوس ضرور ہوتی تھی کہ وہ ایسا کر کے اپنی زندگی کے کسی بڑے ہی مہیب خلا کو پر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اس خلا کا پُر ہوتا آسان نہیں تھا اس لیے انھیں یہاں بھی ناکامی ہی ہوتی تھی ـــــــ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ اس عالم میں کسی نہ کسی ساتھی کے متلاشی رہتے تھے۔ ان کی نظریں کسی دوست اور ہمنوا کو تلاش کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں ـــ اور جب واقعی کوئی دوست انھیں مل جاتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے ان کے دل کی کلی کھل گئی ہے۔ اور وہ فرطِ مسرت سے باغ باغ ہو گئے ہیں ـــــــ حالانکہ مسرت کے حصول سے کہیں زیادہ مسرت سے محرومی کے غم کو وہ اس طرح غلط کرنے کی کوشش کرتے تھے ـــــ تھوڑی دیر کے لیے اس طرح یہ غم غلط ہو بھی جاتا تھا لیکن دیکھنے والے کو ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا جیسے غم کے سائے ان کی زندگی کے اُفق پر پھیل کر کچھ اور بھی بیکراں ہو گئے ہیں۔

یوں مجازؔ تنہا بہت ہی کم رہتے تھے۔ کوئی نہ کوئی انھیں مل ہی جاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس زندگی میں تنہا نظر آتے تھے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی زندگی میں بڑی تنہائی تھی اور اسی لیے وہ اس احساس تنہائی سے پیدا ہونے والے غم کو بھلانے کے لیے دوستوں اور ملنے والوں کی تلاش میں رہتے تھے اور جب کوئی دوست یا ملنے والا انھیں مل جاتا تو وہ

اس کے ساتھ گھنٹوں وقت گزارتے —— دوستوں اور ملنے والوں کی تلاش اور تلاس کے بعد گھنٹوں کافی ہاؤس میں ان کے ساتھ بیٹھنا بھی ان کے معمولات میں داخل تھا —— یہاں وہ خوش گپیاں کرتے، خود ہنستے اور دوسروں کو ہنساتے تھے —— بس اس سے آگے بڑھنا انھیں نہیں آتا تھا۔ اگر کوئی سنجیدہ بات چھیڑ دیتا تو وہ چپ ہو جاتے تھے —— بہر حال صرف وقت گزارنے کی خاطر اس طرح بیٹھنا ان کے مزاج کا جزو بن گیا تھا —— میں بارہا ان کے ساتھ بیٹھا ہوں —— اور مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا ہے کہ ان کی زندگی میں تنہائی کے خلا نے جس غم کو پیدا کیا ہے وہ اُس کو اس طرح بھلانے کی کوشش کر رہے ہیں —— شاید یہی وجہ ہے کہ ایسی محفلوں میں وہ کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ حاضر نہیں ہیں۔ لوگ باتیں کرتے اور وہ خاموش رہتے اور کبھی کبھی تو یہ خاموشی اتنی گہری ہو جاتی کہ انھیں متوجہ کرنا پڑتا۔ تاکہ انھیں اس بات کا احساس رہے کہ وہ اس محفل میں شریک ہیں۔ البتہ ان محفلوں میں جب کبھی بھی بولتے تو ان کا فقرہ مزے دار ہوتا اور اس لیے اس میں لطیفے کا لطف آتا —— لطیفے پر سب لوگ تو ہنستے لیکن وہ خود ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموشی میں ڈوب جاتے۔ اور اس طرح ڈوبتے کہ انھیں بڑی مشکل سے نکال کر باہر لانا پڑتا —— حقیقت یہ ہے کہ غیر شعوری طور پر غم کے شدید احساس ہی کے باعث وہ اس صورتِ حال سے دوچار ہوتے تھے —— یہ زندگی کی تلخیاں ہی تھیں جو ان پر شگفتگی کے باوجود اس خاموشی کو مسلط رکھتی تھیں —— یہی وجہ ہے کہ ان کی ہنسی کی تہہ میں بھی ایک اداسی اور غمگینی کا احساس ہوتا تھا —— وہ ہنستے تھے شگفتہ باتیں کرتے تھے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ یہ سب کچھ غم غلط کرنے کے لیے کر رہے ہیں۔

مجاز بُری طرح شراب پیتے تھے۔ لیکن ان کی یہ شراب نوشی بھی اپنے آپ کو بھلا دینے کے لیے تھی۔ اس میں کسی قسم کا نشاطیہ پہلو نہیں تھا۔ وہ یک گونہ بے خودی چاہتے تھے شراب سے انھیں جو والہانہ وابستگی تھی اس کو دیکھ کر یہ احساس ضرور ہوتا تھا۔ اسی لیے شراب کے

لطیف پہلوؤں کی طرف انھوں نے کبھی بھی توجہ نہیں کی ـــ وہ ہر قسم کی شراب پی سکتے تھے ۔ کیونکہ انھیں تو نشے سے غرض تھی ۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی مقصد نہیں تھا ۔ اسی لیے وہ دیسی شراب تک سے گریز نہیں کرتے تھے ـــ اور ایک زمانہ تو ان پر ایسا بھی گزرا ہے جب وہ "ٹھرّہ"، ہی پیتے تھے شراب کے سُرور سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ پینے تھے تو بس پیتے ہی چلے جاتے تھے ۔ اور جلد ہی ایک ایسی منزل آجاتی تھی جب انھیں دنیا و مافیہا کا خیال ہی نہیں رہتا تھا ۔ وہ اپنے آپ اور گردوپیش سے بے خبر ہوجاتے تھے ـــ اور اس عالم میں دیکھنے والے کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ صرف اسی غرض سے پی رہے تھے کہ جلد بے حال ہوکر اپنے آپ سے باہر ہوجائیں ـــ اسی لیے اس عالم میں ان کو دیکھ کر ہمیشہ افسوس ہوتا اور ترس آتا تھا ـــ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ نشے کے عالم میں جب ان پر بدمستی کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی تو وہ واقعی رحم کے قابل ہوتے تھے ۔

میں نے مجاز کو شراب پیتے اور پی کر اس طرح بے حال ہوتے ہوئے بارہا دیکھا ہے ۔ اور ہمیشہ مجھے یوں محسوس ہوا ہے جیسے یہ شخص زندگی سے مُنہ موڑ کر تیزی سے اپنی موت کی طرف بھاگا جارہا ہے ۔ جوشؔ صاحب کی محفلِ نا ؤ نوش میں انھیں اکثر دیکھا اور انھیں دیکھ کر ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ وہ زیادہ سے زیادہ مقدار میں شراب جلد سے جلد اپنے اندر اتار لینے کے درپے ہیں ۔ چنانچہ تیزی سے پینے اور زیادہ پینے کی کوشش کرتے ـــ نتیجہ یہ ہوتا کہ بہت جلد بہکنے لگتے اور تھوڑی دیر کے بعد انھیں اپنا ہوش نہ رہتا ـــ جوشؔ صاحب کو ہمیشہ ان کی اس حالت پر افسوس ہوتا، وہ اس پر کڑھتے، مجاز کو بُرا بھلا کہتے، شفقت بھرے انداز میں نصیحت کرتے لیکن مجاز کب سنتے تھے ! بالآخر جب ان کی حالت زیادہ خراب ہوتی تو جوشؔ صاحب کہتے "لے جاؤ اس کو" غرض مجاز لے جائے جاتے ۔ ـــ ان کے اعصاب نے جواب دے دیا تھا اس لئے شراب ان کی برداشت سے باہر تھی ۔ لیکن اس صورتِ حال نے شراب کے معاملے میں ان کی حالت ایک ایسے بیمار کی سی کردی تھی جو کھانا کھا نہیں سکتا لیکن کھانے کی ہوس جس کے یہاں شدید سے شدید تر ہوجاتی ہے ـــ مجاز کو شراب کا

ہو گا، ہو گیا تھا ـــ مجازؔ کی شراب نوشی کا محرک یک گونہ بے خودی کا خیال ہوا - انھوں نے ہمیشہ اپنی زندگی کے بے پایاں غم کو بھولنے کے لئے شراب پی لیکن آخر میں تو یہ حال ہو گیا تھا کہ وہ بغیر کسی خیال کے پیتے تھے ـــ مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ مجازؔ کو شراب کی لت پڑ گئی ہے - چنانچہ خاصا زمانہ ان کی زندگی میں ایسا گزرا ہے کہ وہ ہر وقت شراب کے خیال میں سرگرداں رہتے تھے - ان کی زندگی کا اور کوئی مقصد ہی نہیں رہا تھا جب ملتے تو شراب کا ذکر کرتے شراب ملتی تو شراب کی باتیں کرتے خصوصاً ان لوگوں کی صحبت میں جنھیں شراب سے دور کا واسطہ بھی نہیں اور جو خود بقول مجازؔ اس معاملے میں زاہد خشک ہیں ـــ وہ شراب کی باتیں کچھ زیادہ ہی کرتے اور ان باتوں میں حُسنِ طلب کے ساتھ ساتھ ایک حسرت کا احساس بھی ہوتا تھا -

شام کو کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ مجازؔ ہمارے ساتھ بیٹھتے اور ہم لوگ چائے یا کافی پیتے ـــ میں چائے یا کافی کی پیالی بڑھا کر کہتا ـــ "لو بھئی چائے پیو"۔

اِس فقرے پر وہ مسکرا کر ٹھنڈی سانس بھرتے اور کہتے "اچھا"۔

مجھے اِس پر ہنسی آجاتی اور میں چھیڑنے کی غرض سے کہتا ۔"کیوں ـ کیا چائے کو جی نہیں چاہ رہا ہے"۔

وہ پھر ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیتے ۔" جی تو چاہ رہا ہے ـ پی لیں گے ـ لیکن یار! چائے یا کافی بھی کوئی پینے کی چیز ہے"۔

میں کہتا ۔" پھر پینے کی چیز کیا ہے ـ"؟

وہ کہتے " جس کو تمھارے ایسے لوگ نہیں پیتے"۔

غرض وہ جتنی دیر بیٹھتے اسی طرح کی باتوں کا سلسلہ جاری رہتا ـــ وہ بیٹھتے تو ہمارے ساتھ تھے لیکن انھیں خیال شراب کا رہتا تھا ـ اور چائے یا کافی پینے کے بعد شراب کی تلاش میں نکلتے تھے ـ کوئی پینے والا مل گیا تو خیر، ورنہ حالت یہ ہو گئی تھی کہ کوئی دوست مل گیا تو اس کی جیب میں ہاتھ ڈال دیئے اور جو کچھ مل گیا نکال لیا ـ اور جاکر جیسی شراب بھی ملی پی لی ـ اور رات گئے

یا تو بُرے حال میں گھر پہنچے یا پہنچائے گئے ۔

مجاز کے تمام دوست اور عزیز اُن کی شراب نوشی سے خائف تھے ۔۔ جوش صاحب تک جو خود شراب کے والہ وشیدا ہیں مجاز کو بہت ملامت کرتے اور سمجھاتے تھے لیکن مجاز اس منزل سے گزر چکے تھے جب انسان پر کسی کی بات کا اثر ہوتا ہے ۔ انھیں خود اپنے اوپر قابو نہیں رہا تھا ۔۔۔ چنانچہ اس شراب نے مجاز کی جان تک لے لی ۔۔۔ اور ان کی شراب نوشی کا جو عالم تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ یہی چاہتے بھی تھے ۔ زندگی ان کے لئے ایک بوجھ تھی اور اس بوجھ کو اٹھانے کی سکت ان کے اندر باقی نہیں رہی تھی ۔۔۔ اِس لئے انھوں نے شراب کا سہارا لیا ۔۔۔ ساری زندگی اسی کے سہارے جئے اور بالآخر اسی کے سہارے اس دنیا سے سفر کر گئے ۔۔۔ رات بھر شراب پی اور شراب بھی دیسی صبح کو شراب خانے میں ادھ موئے پائے گئے ۔۔ ہسپتال پہنچایا گیا لیکن بے سود ۔۔ شراب نے ان کی جان لے لی یا یوں کہئے کہ شراب کا سہارا لے کر وہ جان دینے کی منزل سے گزر گئے ۔ کیونکہ زندگی کا زہراب ان سے پیا نہیں جاتا تھا ۔

شراب نوشی کو مجاز نے غم غلط کرنے اور زندگی کی تلخیوں کو بھُلانے کے لئے اپنایا لیکن وہ ان کے لئے مصیبت بن گئی ۔ چنانچہ اس شراب نوشی نے ان سے عجیب وغریب حرکتیں بھی کرائی ہیں ۔ اس بھنور میں پھنس کر وہ کبھی کبھی اپنی انسانیت اور شرافت سے بھی گر گئے ہیں جس کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے ۔ شراب پی کر رات گئے سڑکوں پر لڑکھڑاتے پھرنا ، لوگوں سے لڑنا جھگڑنا اور اَول فَول بکنا ان کا شعار بن گیا تھا ۔۔ شراب پینے کے لئے پیسے نہ ہوں تو وہ طرح طرح سے پیسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے کوئی جاننے والا مل جاتا تو اس کی شامت آجاتی ۔۔۔ مجاز اسے چھوڑتے نہیں تھے جو کچھ جس طرح بھی مل جاتا وصول کر لیتے ۔ شراب نہ ہو تو انھیں اس بات کا خیال نہیں رہتا تھا کہ وہ اس کو حاصل کرنے کے لئے کیا کیا کچھ کر رہے ہیں ۔

وہ واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے ۔۔ چند سال ہوئے مجاز پیسوں سے بہت تنگ تھے ۔۔۔ ایک دن جب شراب پلانے والا کوئی دوست بھی نہ ملا تو ایک پبلشر کے پاس پہنچے اور اپنے مجموعۂ کلام کا

معاملہ صرف پچاس روپے میں طے کرلیا۔ پچاس روپے پبلشر نے دے دئے ۔ مجاز نے ان روپوں کی شراب پی لی اور پبلشر نے "سازِ نو" کے نام سے ان کا مجموعہ کلام چھاپ لیا ــــ دوستوں کو جب اس کا علم ہوا تو انھوں نے مجاز کو خوب آڑے ہاتھوں لیا ــ انھوں نے اپنی غلطی تسلیم کرلی ۔ اپنے کئے پر نادم بھی ہوئے لیکن وہ مجبور تھے بعض باتیں ان کے اختیار سے باہر تھیں ۔

مجاز کے مزاج میں حد درجے کا لاابالی پن تھا ۔ کسی کام کو باقاعدگی سے وہ کرنا جانتے ہی نہ تھے کسی جگہ جم کر بیٹھنا ان کے بس کی بات نہیں تھی ۔ تھوڑی دیر بیٹھتے پھر اُٹھ جاتے ۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ دوسری جگہ سے تیسری جگہ ۔ بس یہی ان کا معمول تھا ۔ وہ وعدے کرلیتے لیکن وعدے کو وفا کرنا انھیں نہیں آتا تھا کسی کام کی تکمیل سے وہ کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے ــ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ساری زندگی ایک تلون کے عالم میں بسر کی ۔ کبھی کوئی کام نہیں کیا ۔ کبھی یہ نہیں سوچا کہ کیا کرنا چاہیے ۔ کسی وقت بھی انھیں مستقبل کا خیال نہیں آیا ۔ وہ تو بس حال ہی کو بسر کرنا جانتے تھے ۔ اور وہ بھی کسی قاعدے اور اصول کے ماتحت نہیں ۔ بے اصولی ہی ان کا اصول تھا ــ بے قاعدگی ہی ان کا معیار تھا اور زندگی میں ہر لمحہ وہ اپنے اقوال و افعال سے اس بے اصولی اور بے قاعدگی کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے ۔ اور اس کا سبب بھی یہی تھا کہ انھیں زندگی اور اس کے نظام سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی ۔ حالات نے انھیں زندگی کے ہر پہلو سے بیزار کر دیا تھا ــ وہ تو زندگی کو بھلا دینا چاہتے تھے ـــ اس لئے اس کے اصول اور قدروں کی بھی انھیں پروا نہیں تھی ۔

میں نے مجاز کے لاابالی پن کو صرف دیکھا ہی نہیں مجھے اس سے سابقہ بھی پڑا ہے کیونکہ مجاز کی یہ مشقِ ستم احباب پر سب سے زیادہ ہوتی ــــ چند سال پہلے کا ذکر ہے مجاز ایک دفعہ دلّی آئے تو میزبان کے لئے میرا انتخاب کیا ــ صبح کو دیکھا تو اپنا بکس اور بستر لئے چلے آ رہے ہیں ۔

کہنے لگے ۔ "جوش صاحب کے پاس ٹھہرنے کا ارادہ تھا لیکن سوچا اب کے تمھارے پاس ٹھہروں گا "۔

میں نے کہا ــ "بڑی خوشی کی بات ہے ۔ لیکن یہ آخر یکایک دلّی کا پروگرام کیسے بنا " ؟

بولے ــ "بس یونہی AT RANDOM آ نکلے "۔

میں نے کہا۔ "کوئی مشاعرہ وشاعرہ ہوگا؟"

مجاز نے جواب دیا۔ "مشاعرہ وشاعرہ کوئی نہیں، بہت دنوں سے لکھنؤ میں طبیعت گھبرا رہی تھی۔ ہم نے کہا زرا دتی کی سیر کرلیں"

میں نے کہا۔ "ہاں دلی کی سیر تو کرنی ہی چاہیئے۔ تم نے بہت اچھا کیا۔ اب ایک مہینہ یہیں گزارو۔ اگلے مہینے سے چھٹیاں ہونے والی ہیں۔ پھر ساتھ ہی لکھنؤ واپس چلیں گے"۔

اور وہ اس پر راضی ہو گئے۔

میں نے ان کا سامان وغیرہ رکھوایا۔ وہ نہائے دھوئے اور ناشتہ کرنے کے بعد یہ کہہ کر رخصت ہوئے۔ کہ زرا گھومنے پھرنے جا رہے ہیں کھانے کے وقت تک واپس آجائیں گے ــ لیکن جانے کے بعد تین دن تک لوٹ کر خبر نہ لی۔ خدا جانے کن لوگوں میں پھنس گئے ــ میں نے جوش صاحب کو ٹیلی فون کیا انھوں نے بھی لاعلمی ظاہر کی ــ لیکن تیسرے دن دوپہر کو دیکھا کہ جوش صاحب ہانپتے کانپتے میرے کمرے میں داخل ہوئے اور کہنے لگے "مجاز مر گیا" میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ جوش صاحب کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، ان پر رقت طاری تھی اور یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کرب کی سی کیفیت میں مبتلا ہیں ــ میں نے انھیں تسلی دی اور کہا کہ وہ پرسوں یہاں آئے تھے۔ سامان ان کا یہ رکھا ہوا ہے اس کے بعد سے کہیں غائب ہیں۔ میں سمجھتا تھا آپ کی طرف ہوں گے۔ شاید کسی اور کی طرف چلے گئے ہوں۔

جوش صاحب کہنے لگے۔ "صاحب! ابھی کسی نے مجھے ٹیلی فون پر اطلاع دی ہے کہ وہ مر گیا"۔

میں نے انھیں دلاسا دینے کے خیال سے کہا۔ "آپ فکر نہ کیجئے۔ کسی نے یونہی غلط خبر اُڑا دی ہے"۔

تھوڑی دیر بعد میں نے جوش صاحب کو یہ کہہ کر رخصت کیا کہ آپ جا کر آرام کیجئے میں اُس کو تلاش کرتا ہوں۔

جوش صاحب تو رخصت ہوئے۔ میں نے کچھ لڑکوں کو شہر میں اِدھر اُدھر دوڑایا۔ شام تک انھوں نے مجاز کو ڈھونڈھ نکالا ــ لال کنوئیں میں انھوں نے کسی کے ہاں بُری طرح شراب پی لی تھی

اور بے ہوش پڑے تھے لوگ یہ سمجھے کہ شاید مر گئے۔ اس لئے کسی نے جوش صاحب کو ٹیلی فون پر اطلاع دے دی ——خیر صبح کو مجاز جوش صاحب کے ہاں پہنچائے گئے۔ وہاں پہنچ کر مجاز نے مجھے چند سطریں لکھیں وہ یہ تھیں!

پیارے عبادت!

زندہ ہوں۔

میں بھی تمھارا عجیب مہمان ہوں۔

بہر حال اس وقت حامل رقعہ کے ہاتھ ہمارا ایک کرتہ اور پائجامہ جو کہ ہمارے بستر بند میں ہے اوپر ہی ایک کپڑے میں لپٹا ہوا ہے۔ بھیج دو۔

کل ملیں گے اور رخصت ہوں گے — مجاز

میں نے ان کے حکم کی تعمیل تو کر دی۔ لیکن ساتھ ہی لکھ بھیجا "تم بڑے نالائق ہو— تم نے مجھے بھی پریشان کیا اور جوش صاحب کو بھی تکلیف پہنچائی —— آخر لاابالی پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے"۔

لکھنے کو تو یہ سب کچھ لکھ دیا لیکن مجھے ان کے اس لاابالی پن پر تعجب نہیں تھا۔ یہ تو بڑی معمولی سی بات تھی میں نے تو انھیں اس سے بھی زیادہ عجیب حرکتیں کرتے دیکھا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ حضرت لکھنؤ سے دلی صرف شراب پینے کی غرض سے آئے ہیں —— لکھنؤ میں تو انصار ہاروانی نے ان پر سخت احتساب کر رکھا تھا اور انصار سے یہ ڈرتے بھی تھے۔ اسی لئے تنگ آکر دلی کی طرف بھاگے ہیں —— اور میرا یہ خیال سو فی صدی صحیح نکلا۔

یہ لاابالی پن اور بے راہ روی مجاز کی شخصیت میں سب سے زیادہ نمایاں تھی۔ وہ اسی سے پہچانے جاتے تھے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کے علاوہ بھی ان کی شخصیت میں بہت کچھ تھا۔ وہ بڑے ہی شریف آدمی تھے نیکی اور سیدھے پن کی خصوصیت بقول شخصے ان کی گھٹی میں پڑی تھی —— انھیں کسی شخص سے بگڑنا نہیں آتا تھا۔ وہ کسی کے ساتھ برائی نہیں کر سکتے تھے۔ کسی کی بہتری کے سوا کوئی اور بات ان کے ذہن میں آتی ہی نہیں تھی۔ کسی سے انتقام لینا تو وہ جانتے ہی نہیں تھے ——

ان کی شخصیت میں شرافت ہی شرافت تھی۔ اُن کا خلوص بے پایاں تھا — ان کی محبت بے اندازہ تھی۔ وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے — ان کی دوستی پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا — اور اس میں شک نہیں کہ وہ بہت ہی اچھے دوست تھے — انھوں نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا — کبھی کوئی چھچھوری بات نہیں کی — نشے کی اور بات ہے لیکن ہوش کے عالم میں میں نے کبھی بھی انھیں شرافت کے دائرے سے باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا — وہ کبھی بھی نیچے نہیں گرے۔ انھوں نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی — کبھی کسی کو بے جا طور پر نہیں سراہا۔ انھیں تکلف اور بناوٹ سے نفرت تھی۔ وہ جو کچھ تھے وہی اپنے آپ کو ظاہر کرتے تھے۔ انھیں شہرت کی خواہش نہیں تھی — ناموری کی پروا نہیں تھی۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز تھے۔ انھیں ہمیشہ خیر کا خیال رہتا تھا۔ شر کے تو وہ پاس بھی نہیں پھٹکتے تھے — بُرائی کا انھیں خیال بھی نہیں آتا تھا وہ تو ایک رند تھے۔ اور رندی کی تمام خصوصیات ان کے اندر موجود تھیں۔

اور یہ رندی مجاز کے مزاج میں داخل تھی۔ اور اسی رندی کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ لاأبالی مزاج تھے۔ ان کی طبیعت میں بے راہروی تھی۔ باقاعدگی کی کسی قدغن کو وہ اپنے لئے ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ انھیں خود اپنے اوپر قابو نہیں تھا بعض معاملات میں تو وہ بالکل ہی بے بس تھے۔ اور یہ خصوصیات درحقیقت ایک 'جینس' کی خصوصیات تھیں۔ 'جینس' میں کسی نہ کسی طرح کی بے راہروی کسی نہ کسی نوعیت کی بے قاعدگی ہوتی ضرور ہے — مجاز بھی ایک 'جینس' تھے اور اس لئے یہ بے قاعدگی اور بے راہروی کی خصوصیات ان کے یہاں بھی پائی جاتی ہیں — یہی وجہ ہے کہ انھیں ان مذمومات کا شکار دیکھ کر ہمیشہ محبت اور ہمدردی کا جذبہ بیدار ہوتا تھا۔ مجھے تو ان کی ایسی باتوں پر ہمیشہ پیار آیا ہے — اور اس میں شک نہیں کہ وہ پیار کرنے ہی کی چیز تھے — مجاز کی زندگی کے اس لاأبالی پن میں بھی ایک معصومیت اور سادگی تھی۔ وہ کسی اوباشی کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ مجاز کی حالت اس معاملے میں بالکل اس معصوم بچّے کی سی تھی جو نتائج کو سمجھے بغیر بعض ایسی حرکتیں بھی کرتا ہے جن سے سوائے نقصان کے کبھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اور اگر اس کو نہ روکا جائے تو یہ حرکتیں اس کی زندگی بن جاتی ہیں — مجاز بھی ساری زندگی کچھ ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار رہے۔ مجاز کی

زندگی کے اس پہلو کو لوگ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ اور دیکھنا بھی نہیں چاہیئے تھا — عزیز اور دوست سب ان سے نالاں تھے۔ لیکن کبھی کسی نے یہ غور نہیں کیا کہ اس شخص کی زندگی میں محرومیوں اور ناکامیوں نے کتنے بڑے خلا کو پیدا کیا تھا — اور مجاز کی یہ حرکتیں درحقیقت اس خلا کو پُر کرنے کی ایک غیر شعوری کوشش تھیں اور پھر کون سا 'جینیس' ایسا گزرا ہے جو اس قسم کی بے راہروی کا شکار نہ ہو — ایسا کیوں ہوتا ہے —؟ 'جینیس' میں باقاعدگی کیوں نہیں ہوتی۔؟ وہ زندگی کے مروجہ نظامِ اقدار سے بغاوت کیوں کرتا ہے؟ اس کو سکون کیوں نہیں ملتا؟ اس کی زندگی میں ہنگامے کیوں ہوتے ہیں؟ وہ کسی کی پرواکیوں نہیں کرتا؟ کسی کی بات کیوں نہیں مانتا؟ اپنی موت کو کیوں دعوت دیتا ہے؟ — مجاز کی شخصیت کو دیکھ کر یہ اور اسی قسم کے ان گنت سوالات ہمیشہ میرے ذہن میں اُبھرے ہیں — لیکن میں انھیں حل نہیں کرسکا ہوں۔ یہ باتیں آج بھی میرے لئے ایک معمہ ہیں۔

مجاز ایک 'جینیس' تھے۔ اس لئے ان کی زندگی میں یہ بے راہروی ایسی کچھ عجیب نہیں معلوم ہوتی۔ اس پر افسوس ضرور ہوتا ہے لیکن ان کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا — اور یہ حقیقت ہے کہ مجاز کی اس بے راہروی پر افسوس کرنے والے تو بہت تھے لیکن ان سے نفرت کرنے والا ایک بھی نہیں تھا — بات یہ ہے کہ مجاز کی اس بے راہروی میں بڑی انسانیت تھی — انسان ہر اعتبار سے مکمل نہیں ہوتا۔ اس میں کمزوریاں ہوتی ہیں اور یہ کمزوریاں مجاز میں بھی تھیں اور ان کی بے راہروی درحقیقت انھیں انسانی کمزوریوں کا مظہر تھی۔ اس لئے میں تو ان کی اس بے راہروی کو ہمیشہ نظرانداز کرنے کے لئے مجبور ہو گیا ہوں کیونکہ میں نے خود انھیں اس معاملے میں مجبور پایا ہے۔ کوئی ان دیکھی طاقت ان سے وہ سب کراتی تھی جو وہ خود کرنا نہیں چاہتے تھے — اس لئے ان کی بے قاعدگی اور بے راہروی کو دیکھ کر ان پر ترس آتا تھا اور ان سے ہمدردی کرنے کو جی چاہتا تھا — کئی بار ایسا ہوا ہے کہ انھیں بُرے حال میں دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مجھ پر رقت طاری ہو گئی خصوصاً اس وقت جب میں نے یہ دیکھا کہ ان کی انسانیت اور شرافت اس بدہوشی کے عالم میں بھی برابر چھپ چھپ کر اپنے آپ کو رُونما کرتی رہتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مجاز طبعاً بڑے ہی نیک اور شریف آدمی تھے۔ نشے کی اور بات ہے

لیکن ویسے اس شرافت کا مظاہرہ وہ ہر وقت اپنی حرکات وسکنات سے کرتے رہتے تھے۔ انھیں اپنی خاندانی شرافت کا بڑا خیال تھا۔ وہ اپنے بزرگوں کی عزت کرتے تھے۔ چھوٹوں کا لحاظ ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتا تھا۔ وہ بیکار اور لایعنی باتیں کبھی بھی نہیں کرتے تھے۔ دل کی بات کو وہ دل کے اندر رکھنے کے قائل نہیں تھے جو کچھ ان کے دل میں ہوتا وہ زبان پر آجاتا تھا۔ وہ ہمیشہ سچ بولتے اور سچ بات کے لئے جان کی بازی تک لگا دینے کو تیار رہتے تھے ـــــ وہ بڑے ہی غیور اور بے باک تھے۔ انھیں کسی سے دبنا اور کسی کی خوشامد کرنا نہیں آتا تھا۔ وہ کسی قسم کی غلط بات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی آواز ہمیشہ حق کی آواز ہوتی تھی کسی کی تکلیف کو دیکھ کر ان کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا اور وہ بہت جلد بے چین ہو جاتے تھے ــ مجھے مجاز کی زندگی کے ایسے بے شمار واقعات کا علم ہے۔ جو اُن کی شخصیت کی ان خصوصیات کو واضح کرتے ہیں۔

مجاز یوں تو ایک رند لا اُبالی مزاج تھے لیکن اپنے بزرگوں کے سامنے ان کی رندی بھی ختم ہو جاتی تھی، لا اُبالی پن بھی جواب دے دیتا تھا۔ مجاز کو شراب کی بُری عادت طالب علمی کے زمانے ہی میں پڑ گئی تھی۔ لیکن ایک زمانے تک انھوں نے اپنے والدین اور دوسرے بزرگوں سے اس کو چھپائے رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ ظاہر ہے اس بات کو وہ کب تک چھپا سکتے تھے۔ بالآخر ان کے گھر والوں کو اس کا علم ہو گیا لیکن اس کے باوجود مجاز یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ اس بُری عادت کا شکار نہیں ہیں ــ بلکہ جن لوگوں نے بھی ان کے والدین کو اس طرف متوجہ کیا ان سے وہ خفا ہو جاتے تھے۔ حالانکہ ویسے انھیں خفا ہونا نہیں آتا تھا ـــ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ شوکت تھانوی صاحب نے مجاز کے والد صاحب سے مجاز کا ذکر کرتے ہوئے بڑی تعریفوں کے بعد آخر میں یہ کہہ دیا کہ مجاز کو شراب نوشی کی بُری عادت پڑ گئی ہے کسی طرح اسے چھڑا دیجئے ـــ یہ خبر مجاز تک بھی پہنچی ــ بہت خفا ہوئے اور اکثر دوستوں سے شوکت کی شکایت کی اور کہا کہ میں نے شوکت سے یہ کہہ دیا ہے کہ وہ یا تو میرے والد سے دوستی رکھیں یا مجھ سے۔ بہ یک وقت باپ بیٹے دونوں سے دوستی مناسب نہیں۔ شوکت صاحب نے تو حقیقت کا اظہار کیا تھا مجاز اس پر خفا نہ ہوتے،

خفا ہونے کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کی شراب نوشی کا ذکر ان کے گھر والوں سے کیا گیا تھا۔ اور وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کے گھر والوں کو ان کی شراب نوشی کا علم ہے، نہیں چاہتے تھے، کہ اس بُرے کام کا تذکرہ ان لوگوں سے کیا جائے۔

یوں بظاہر دیکھنے میں یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ مجازؔ کی ایک گھریلو زندگی بھی ہے کیونکہ وہ ہمیشہ گھر سے باہر ہنگامے کرتے رہتے تھے لیکن ان کی ایک گھریلو زندگی بھی تھی۔ وہ گھر کے معاملات میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ خاندان کے ہر فرد کا حتی الامکان خیال رکھنے کی کوشش کرتے۔ والدین اور بھائی بہنوں سے تو انھیں والہانہ محبت تھی خاصا وقت وہ گھر میں گزارتے تھے — کبھی کہیں سے کچھ آمدنی ہوجاتی تو ضرور کچھ نہ کچھ چیزیں گھر والوں کے لئے خرید کرلے جاتے — بیہوشی کے عالم میں بھی انھیں اس بات کا ہوش رہتا تھا — اپنے چھوٹوں کا انھیں خاص طور پر بڑا پاس لحاظ رہتا تھا — انصارؔ اور صفیہ کا وہ کہنا مانتے تھے — انصارؔ ہی کے کہنے سے وہ کبھی کبھی شراب چھوڑ دیتے تھے — بلکہ انصارؔ سے تو وہ ڈرتے بھی تھے۔ اس سے تو ان کی روح قبض ہوتی تھی — اس لئے نہیں کہ وہ اُن پر سختی کرتا تھا بلکہ اس لئے کہ اس کی بات کو رد کرنے کی سکت ان میں نہیں تھی۔

مجازؔ نے کبھی جم کر کوئی ملازمت نہیں کی — ریڈیو میں ملازم ہوئے لیکن زیادہ عرصے نہ رہ سکے۔ ہارڈنگ لائبریری دہلی میں کچھ عرصے کام کیا لیکن وہاں بھی وہ زیادہ دنوں جم نہ سکے۔ اس میں ان کی طبیعت کے انتشار، مزاج کے تلون، رندی اور لاابالی پن ہی کو دخل نہیں تھا، آزادی کا خیال اور خودداری کا احساس بھی اس میں شامل تھا — اس لئے وہ ملازمت کو ہمیشہ بُرا بھلا کہتے کیونکہ ان کے خیال میں ملازم کو دوسرے کا مُنہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اس کی انفرادیت ختم ہوجاتی ہے — خودداری پر زخم کاری لگتا ہے — اور انسان اس طرح کسی کام کا باقی نہیں رہتا — پھر یہ بھی ہے کہ اپنے مزاج کے خلاف باتیں کرنی پڑتی ہیں — بے جا خوشامد کرنی پڑتی ہے — خواہ مخواہ ہاں میں ہاں ملانی پڑتی ہے — یہی وجہ ہے کہ ساری زندگی عسرت اور پریشانی کے

عالم میں رہے لیکن ملازمت کو زندگی کے لئے ایک لعنت ہی سمجھا اور اسی لئے اس سے دور بھاگتے رہے۔
لیکن کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ ان کی غیرت مندی کا یہ ایک ادنیٰ ثبوت ہے۔

مجاز کی بے باکی اور صاف گوئی بھی ان کی شخصیت کا نمایاں وصف تھا۔ وہ کسی کی لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے جو کچھ بھی ان کے دل میں ہوتا زبان پر آجاتا تھا — نشے کی حالت میں بھی وہ ایسا کرنے سے باز نہیں رہتے تھے — پچھلی جنگ کے زمانے کی بات ہے، جب اُردو کے بعض شاعروں نے حکومت کی ملازمتیں کر لی تھیں اور اس طرح شاعر سے افسر ہو گئے تھے — انھیں دنوں دلّی ریڈیو پر ایک مشاعرہ ترتیب دیا گیا — اس مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر تاثیر مرحوم کر رہے تھے۔ اور اس میں فیض (جو اس زمانے میں لفٹننٹ کرنل یا کرنل ہو گئے تھے) اور بعض دوسرے شعرا بھی شریک تھے — مجاز کا قیام ان دنوں دلّی ہی میں تھا۔ انھیں بھی مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی گئی — مجاز مشاعرے میں زرا تاخیر سے پہنچے — بُری طرح نشے میں تھے۔ جب انھیں پڑھنے کے لئے مائیکروفون پر طلب کیا گیا تو وہ اپنی جگہ سے جھومتے جھامتے اُٹھے اور اپنی نظم یا غزل پڑھنے سے قبل یہ شعر پڑھنا شروع کیا ؎

شاعر ہوں اور امیں ہوں عروسِ سخن کا میں
کرنل نہیں ہوں خان بہادر نہیں ہوں میں

لیکن مجاز کی آواز یہ شعر پڑھتے پڑھتے ڈوب گئی — ریڈیو کو بند کر دیا گیا — اس زمانے میں تو یہ حکومت کی توہین تھی — خان بہادر اور کرنل قسم کے شاعر تو خیر اس پر کچھ زیادہ چیں بجبیں نہ ہوئے لیکن ریڈیو کے محکمے میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا — کئی دن تک کھچڑی پکتی رہی اور آخر میں نتیجہ یہ نکلا کہ ریڈیو پر مجاز کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا — لیکن مجاز ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی کب پروا کرتے تھے — مُنہ تک آئی ہوئی بات ان سے رُکتی نہیں تھی — نشے کے عالم میں بھی انھیں اس بات کا خیال رہتا تھا — اور وہ اس کا اظہار کر دیتے تھے — بدیسی حکومت کی ملازمت ان کے نزدیک ایک لعنت تھی — حکومت کی پرورش کو وہ شاعر کی توہین سمجھتے تھے۔ جنگ کے زمانے میں حکومت یہ ہتھکنڈے استعمال کر رہی تھی اور اس نے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو

خرید لیا تھا ـــ مجازؔ اس کو بُری نظر سے دیکھتے تھے ـــ اور اس کے اظہار میں انھیں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا تھا ۔ ریڈیو کی محفلِ مشاعرہ تک اس سے نہیں بچ سکتی تھی ۔ کرنلوں اور خان بہادروں کے سامنے بھی وہ بے باکی کے ساتھ اپنی رائے پیش کرنے میں نہیں جھجکتے تھے ۔

اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ مجازؔ کو انسان عزیز تھا ، انسان کی انسانیت عزیز تھی اور انسانیت کی بنیادی قدریں عزیز تھیں اور چونکہ انسان کو وہ بہت عظیم سمجھتے تھے اس لئے اس کی توہین ان سے برداشت نہیں ہوتی تھی ـــ چنانچہ جب بھی وہ انسانیت کی قدروں کو گھائل ہوتا ہوا دیکھتے تو ان کا پارہ چڑھ جاتا تھا ـــ اور وہ کسی کو بھی بخشتے نہیں تھے ـــ انھیں انسانوں سے دلچسپی تھی ایسے انسانوں سے جو صحیح معنوں میں انسان ہوں ، جنھیں انسانیت کی قدریں عزیز ہوں ـــ اور یہ خوبیاں انھیں ملمع کئے ہوئے انسانوں سے کہیں زیادہ ان عام انسانوں میں نظر آتی تھیں جو نام نہاد تہذیب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ـــ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انھیں عوام سے دلچسپی اور ہمدردی تھی اور وہ انھیں کو انسانیت اور انسانی قدروں کا علم بردار سمجھتے تھے اسی لئے مزدوروں اور کسانوں کی تکلیف ان سے دیکھی نہیں جاتی تھی ۔

مجازؔ کو انھیں باتوں نے اشتراکیت سے قریب کیا ۔ اور اس میں شک نہیں کہ وہ نظریاتی طور پر ایک سچے اشتراکی تھے ۔ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے اشتراکی فکر و فلسفہ کا گہرا مطالعہ نہیں کیا تھا لیکن نظامِ اقدار کی ناہمواری کے شدید احساس نے مجازؔ کو اشتراکی بنا دیا تھا اس احساس نے ان پر یہ حقیقت روشن کر دی تھی کہ انسانیت کا مداوا یہی اشتراکی نظام ہے ـــ اس کے مسائل اسی نظام کے سہارے حل ہو سکتے ہیں ۔ چنانچہ مجازؔ نے اشتراکی نظام کے قیام کو ضروری سمجھا ہے ۔ اور اس طرف توجہ بھی دلائی ہے ۔ اس کا پیام بھی دیا ہے ـــ لیکن وہ اس منزل تک جذبات کے راستے سے پہنچتے ہیں ـــ عقل و شعور کی کارفرمائی اس میں کم نظر آتی ہے ۔ علمی اور حکیمانہ زاویۂ نظر کا احساس بھی اُن کے یہاں نہیں ہوتا ـــ لیکن اس سے ان کے اشتراکی نظریے کو ٹھیس نہیں لگتی ۔

کیونکہ ان کی ذہانت ان باتوں کے بغیر بھی اُنھیں صحیح قسم کا اشتراکی بنا دیتی ہے ـــــ ایک اشتراکی کی علمیت تو بے شک ان کے یہاں نہیں تھی لیکن ویسے جہاں تک سوچنے کا تعلق ہے وہ اشتراکی زاویۂ نظر سے سوچتے تھے ـــــ یہی وجہ ہے کہ انھیں سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ نظام سے نفرت تھی امرا اور روسا سے نفرت تھی ـــــ مزدوروں سے وہ زیادہ قریب تھے ـــــ عوام سے انھیں زیادہ لگاؤ تھا ـ یہی وجہ ہے کہ بڑے لوگوں میں انھیں بٹھا دیا جائے تو وہ پریشان ہو جاتے تھے ـ ایسے ماحول میں ہمیشہ ان کا دم گھٹتا تھا ـــــ اور وہ ہمیشہ ان سے بچنے کی کوشش کرتے تھے ـــــ چنانچہ جب اس موضوع پر بات کرتے ان کی بے ربط باتوں میں بھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مارکسی فلسفے کے اسرار و رموز کو صحیح طور پر پیش کر رہے ہیں ـ

مارکسیت سے ان کی یہ دلچسپی محض جذباتی ہی نہیں تھی وہ ذہنی طور پر بھی ایک اشتراکی تھے ـ ہر چند کہ انھوں نے اشتراکی نظریات کا گہرا مطالعہ نہیں کیا تھا ـ لیکن چونکہ اشتراکی نظریات سے وہ ایک طبعی مناسبت رکھتے تھے اس لئے اس کی بنیادی باتوں سے انھوں نے واقفیت حاصل کر لی تھی اور پھر اپنی خدا داد ذہانت سے وہ ان اصولوں اور نظریات کی روشنی میں زندگی کے ہر پہلو کو کچھ اس طرح دیکھتے تھے کہ نتائج صحیح نکلتے تھے ـــــ لیکن جہاں تک ان اصولوں اور نظریات کو برتنے کا تعلق ہے وہ اس میں انتہا پسند نہیں تھے ـ خصوصاً ادب و شعر کے معاملے میں ان کا یہ تصور نہیں تھا کہ کوئی بات ایسی کہی ہی نہ جائے جو پارٹی لائن کے خلاف ہو ـــــ اس معاملے میں وہ خاصے کشادہ دل اور روشن دماغ تھے اور شاعر کو شاعر پہلے سمجھتے تھے ـ چنانچہ جنگ کے زمانے میں جب ان کی نظموں پر خالص اشتراکی نقاد اعتراض کرتے تو وہ مذاق میں ہمیشہ یہی کہہ دیتے "جی ہاں! یہ نظم ذرا پٹری سے اُتر گئی ہے" ـــــ حالانکہ ان کی نظمیں یوں پٹری سے کم ہی اُترا کرتی تھیں ـ لیکن خالص اشتراکی نقاد یہ سمجھتے ضرور تھے کہ وہ پٹری سے اُتری ہوئی ہیں ـــــ لیکن مجازؔ نے کبھی ان باتوں کی پروا نہیں کی وہ جو کچھ خود صحیح سمجھتے تھے وہی کرتے تھے ـــــ میکانیکی انداز اُن کے تخلیقی مزاج کو اور فن کارانہ ذہن کو ڈانواں ڈول نہیں کر سکتا تھا ـ

مجازؔ صحیح معنوں میں ایک تخلیقی فن کار اور ایک شاعر تھے ـــــ اس تخلیقی فن کار اور شاعر کو فکر و خیال کی جو آزادیاں ہونی چاہئیں وہ مجازؔ کو بہت عزیز تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ میکانیکی نقادوں کی ہر بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے بلکہ ہمیشہ ان کی باتوں کو مذاق میں اُڑا دیتے تھے۔ اُن کے خیال میں شاعر کا اپنا ایک زاویۂ نظر ہوتا ہے۔ وہ لکیر کا فقیر نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ خود ان کی شاعری میں جدّت اور اچھوتے پن کا احساس ہوتا ہے۔ اور اس جدت اور اچھوتے پن کو پیدا کرنے میں ان کی ذہانت اور طباعی کو بڑا دخل ہے۔ اچھوتے پن کے بغیر ان کی کوئی بات ہوتی ہی نہیں تھی۔ یہی خصوصیت ان کی شاعری میں بھی سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔

نہ صرف شاعری بلکہ ان کی ایک ایک بات سے یہ اچھوتا پن ٹپکتا تھا ـــــ وہ ہر بات پر کوئی نہ کوئی فقرہ کستے اور کوئی نہ کوئی لطیفہ تراشتے تھے ـــــ اور اس فقرے اور لطیفے میں بڑی ہی لطافت ہوتی تھی، بڑی ہی نفاست کا احساس ہوتا تھا۔ فقرے اور لطیفے اکثر مبتذل ہو جاتے ہیں۔ لیکن مجازؔ کو میں نے کبھی مبتذل ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ اس فقرے اور لطیفے میں بات کی تہ تک پہنچتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اور درحقیقت لطیفے اور فقرے سے یہی اُن کا مقصد ہوتا تھا ـــــ لیکن ان میں سب سے زیادہ ان کی شگفتی اور ظرافت، برجستگی اور لطافت اپنی طرف متوجہ کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مجازؔ ان فقروں اور لطیفوں سے روتوں کو ہنسا سکتے تھے، بزمِ ماتم کو محفلِ نشاط بنا سکتے تھے اور مجازؔ کے یہ فقرے اور لطیفے دو چار نہیں ہیں، دس بیس نہیں ہیں بلکہ اگر یہ جمع کیے جائیں تو ان کی تعداد ہزاروں تک ضرور پہنچ سکتی ہے ـــــ کیونکہ مجازؔ کی تو ہر بات میں لطیفے کا پہلو ہوتا تھا ـــــ چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی سے معمولی بات بھی جب مجازؔ کی زبان سے ادا ہوتی تو اس میں دل موہ لینے والا انداز پیدا ہو جاتا ـــــ مثلاً وہ بات ایک معمولی ہی سی بات تو تھی جو موٹر کار کو دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر آجاتی تھی ـــــ موٹر کار کو دیکھ ہمیشہ وہ یہ کہا کرتے "یار! یہ موٹر زن سے ہمارے قریب سے اس طرح گزرتی ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم پر طنز کر رہی ہے" ـــــ یا پھر شادی کے بارے میں ان کا یہ فقرہ کہ "بھئی شادی تو ٹھیک ہے لیکن اس کے بعد وہ جو ایک وادی

ہوتی ہے وہ اچھی خاصی مصیبت ہے ۔ آدمی گھن چکّر ہو جاتا ہے گھن چکر"۔۔۔۔۔ اسی طرح مجاز کا ایک اور فقرہ بھی بہت دلچسپ ہے۔۔۔۔ ایک صاحب کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا اور وہ دوسری شادی کی فکر میں تھے ۔ احباب ان سے پوچھ رہے تھے کہ آخر اس میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے ؟۔۔۔۔ اس پر وہ صاحب بولے" صاحب ! میں کسی بیوہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور ابھی تک کوئی بیوہ ملی نہیں"۔ مجاز یہ سنتے ہی بول اُٹھے۔۔"صاحب! اس میں کون سی قباحت ہے۔ آپ شادی کر لیجئے وہ خود ہی بیوہ ہو جائے گی"

پاکستان بننے کے بعد مجاز مشاعرے میں شرکت کی غرض سے کراچی اور لاہور آئے۔۔۔۔ کچھ عرصے قیام کے بعد لکھنؤ واپس پہنچے ۔ تو پاکستان کی بہت سی باتیں کہیں۔۔۔ اور آخر میں کہنے لگے "پاکستان بننے سے مجھے بہت فائدہ ہوا ہے ۔ میری اہمیت بہت بڑھ گئی ہے "

میں نے کہا" وہ کیسے ؟"

کہنے لگے۔۔" جانتے نہیں ہو میں FOREIGN COUNTRY کی سیر کر کے آرہا ہوں۔ اور اب میں بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بھی ایک FOREIGN COUNTRY دیکھا ہے۔"

غرض اس قسم کے ان گنت فقرے اور لطیفے مجاز نے ہمیں دئے ہیں۔۔۔۔ وہ ایک باغ و بہار آدمی تھے اور ہر لمحہ ان لطیفوں اور فقروں کے پھول بکھیرتے رہتے تھے ۔ انھیں جمع کر کے محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے ۔ کیونکہ وہ ایک ایسے انسان کی تخلیق ہیں جو اس فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتا ۔

مجاز یوں تو ایک باغ و بہار قسم کے انسان تھے لیکن ویسے ان کی زندگی ایک بہت بڑا المیہ تھی۔۔۔۔ زندگی کو انھوں نے بہت کچھ دیا۔ لیکن وہ خود زندگی سے محروم رہے۔ کہنے کو تو وہ زندہ تھے لیکن ان کی زندگی کے انداز کو دیکھ کر ہمیشہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ زندگی سے تنگ آکر اور پریشان ہو کر موت کی طرف بھاگ رہے ہیں۔۔۔۔ چنانچہ میں نے انھیں دیکھ کر ہمیشہ یہ اندازہ لگایا ہے کہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ اس چراغ کی طرح بجھتے جا رہے ہیں جس میں تیل

باقی نہیں رہتا ـــــ ان کی شگفتگی بھی وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہوتی جارہی تھی ـــــ مگر گذشتہ سال جب میں ان سے لکھنؤ میں ملا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ہر وقت چہکنے والے اس باغ و بہار انسان کو چپ سی لگ گئی ہے ـــــ بہت کم باتیں کرتے ہیں اور جب باتیں کرتے بھی ہیں تو زندگی کی الجھنوں اور پریشانیوں کی باتیں کرتے ہیں اور زندگی کا رونا روتے ہیں۔ میں کافی ہاؤس پہنچا تو دیکھا ایک کونے میں بیٹھے ہیں - تین چار نوجوان لڑکے ان کے آس پاس ہیں بڑے تپاک سے ملے دیکھ کر کلی کلی کھل گئی۔ بغل گیر ہوئے - اور پھر میں اسی میز پر بیٹھ گیا ـــ اور اس طرح ایک زمانے کے بعد ایک دفعہ پھر پرانی صحبتوں کی یاد تازہ ہوئی ـــــ لیکن میں نے ان کے اندر خاصا تغیر محسوس کیا۔ اب وہ باتوں میں ہنستے نہیں تھے۔ فقرہ مشکل ہی سے ہوتا تھا ـــــ سنجیدگی کے عالم میں گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے پرانی صحبتوں کا ذکر کر کے ہنسانے کی کوشش کی لیکن وار خالی گیا۔ گفتگو اس دائرے سے باہر نہ نکل سکی -

"بھئی خوب آئے"

"لکھنؤ دیکھنے اور احباب سے ملنے کی خاطر آ گیا ـــ بہت جی چاہتا تھا"

"لکھنؤ اب کہاں"؟

"غزالان لکھنؤ کا کیا حال ہے؟"

"اب یہاں کوئی غزال نہیں سب چلے گئے"

"پھر جی کس طرح لگتا ہے؟"

"وقت کاٹتے ہیں - مانوس صورتیں تک دیکھنے کو نہیں ملتیں"

"ماحول کو بدلنا ہی چاہیئے تھا"

"ہو کا عالم ہے ویرانی ہی ویرانی ہے - ایسا بھی ماحول کا بدلنا کیا ہوا"

"وقت کس طرح گزرتا ہے؟"

"دن بھر گھر میں پڑے رہتے ہیں۔ شام کو ادھر آ نکلتے ہیں"

"شعر و شاعری کا کیا حال ہے"۔

"بہت دنوں سے کچھ نہیں کہا۔ شعر اس ماحول میں کہاں ہوتا ہے"۔

"لاہور کیوں نہیں آتے؟"

"دل بجھ گیا ہے۔ کہیں آنے جانے کو جی نہیں چاہتا"۔

"صحت کیسی ہے؟"

"بس جی رہے ہیں"۔

غرض کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک کچھ اسی طرح کی گفتگو کے بعد ہم وہاں سے اٹھے۔ مجاز کو اتنا سنجیدہ میں نے کبھی نہیں پایا۔ اس درجہ قنوطیت کا شکار کبھی نہیں دیکھا وہ بالکل بجھ گئے تھے ان میں کوئی شگفتگی باقی نہیں رہی تھی بات کرنے میں بھی انھیں تکلف ہوتا تھا— بات کیجئے تو جواب دیتے جاتے تھے۔ ورنہ محسوس تو یہ ہوتا تھا جیسے ان میں بات کرنے کی سکت ہی نہیں ہے۔ وہ بول سکتے ہی نہیں— انھیں اس عالم میں دیکھ کر معلوم ہوا کہ اب ان کا غم پھیل کر بیکراں ہو گیا ہے۔ وہ اس میں ڈوب گئے ہیں۔ اور انھیں اپنے گرد و پیش سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے— ان کے خلوص میں کمی نہیں ہوئی تھی— لیکن اس خلوص کا اظہار جس طرح وہ کیا کرتے تھے اب ان سے ممکن نہیں تھا— اب تو وہ صرف رونا رو سکتے تھے— چنانچہ وہ دیر تک زندگی کے ناسازگار حالات کا رونا روتے رہے— اور میں برابر سوچتا رہا کہ وہ شخص جو کبھی "مطرب بزم دلبراں، اور شاعر محفلِ وفا" تھا اور جس سے وابستہ ہونے کے لیے لوگ اپنی تنہائیوں میں جھوٹ موٹ محض دل بہلانے کی غرض سے قرعے نکالتے تھے— اس کو زمانے نے کسی طرح ایک شمع کشتہ بنا دیا ہے۔ زندگی کتنی عجیب ہے۔

مجاز میں یہ حیرت انگیز تبدیلی دیکھ کر میرا ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا اور بہت سے خیالات میرے ذہن میں آئے تھے— ایسے خیالات جنھیں میں ذہن میں لانا نہیں چاہتا تھا— لیکن جن سے باوجود کوشش کے میں پیچھا نہ چھڑا سکا اور پھر یہ تمام خیالات ایک دن حقیقت بن گئے۔

جب کسی نے لاہور میں ٹیلی فون پر یہ خبر سنائی کہ مجازؔ اس دنیا سے منہ موڑ کر ہمیشہ کے لیے چل دیئے پیروں تلے سے زمین نکل گئی لیکن مجھے اس پر تعجب نہیں ہوا کیونکہ یہ تو مجھے عرصے سے معلوم تھا کہ مجازؔ مرنے کی آرزوؤں میں مرتے ہیں ——— ان کی یہ آرزو پوری ہو گئی ——— شاید اب انھیں سکون مل گیا ہوگا ——— لیکن کون جانے کہ اب بھی انھیں سکون ملا ہے کہ نہیں!

انتخاب کلام مجاز

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

انتخاب سخن بنیادی طور پر ذاتی پسند کا عمل ہے اور شاید اسی لئے رسوائی کا سبب بھی! ذاتی پسند کا یہ عمل قدماء کے یہاں دیدہ زیب بیاضوں کی شکل اختیار کر لیتا تھا، اس لئے ہر وہ شخص جو صاحبِ دیوان نہیں بن سکتا تھا، صاحب بیاض ضرور ہوتا' موجودہ زمانے میں شعراء کے انتخابات مخصوص مسلک اور نقطۂ نظر کے تحت بھی کئے جانے لگے ہیں۔ تحسین شناسی کا یہ ایک خطرناک رجحان ہے۔ اس میں شک نہیں ہر شاعر کا انتخاب ہر عہد میں مختلف انداز پر ہوگا، لیکن اس کے چند رشحات قلم سے کوئی انتخاب خالی نہیں ہو سکتا۔ یہ اس بات کی بین دلیل ہے کہ اس کے کلام کا کچھ حصہ ہر عہد اور عصر کے مذاق کی تسکین کا سامان اپنے اندر بہم رکھتا ہے۔ کچھ حصہ ایسا بھی ہوگا جو رد و قبول کے عمل سے گزرے گا۔ اسی سے نئے ادبی ذوق کی نشان دہی کی جائے گی۔

مجاز کے کلام کا کوئی انتخاب ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے، لیکن مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک زمانے میں مجاز کے کلام کے ان حصوں پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے جو کسی وقتی تقاضہ یا مسلک کی ضرورت کو پورا کرتے رہے ہیں۔ یہ وقتی تقاضہ "نمائش" بھی ہو سکتی ہے اور "ہمارا جھنڈا" بھی۔ مجاز کا بحیثیت غزل گو بھی کافی چرچا رہا ہے۔ حالانکہ مجاز صحیح معنوں میں غزل کے شاعر نہیں۔ اس سانچے میں ڈھل کر ان کی آواز کا سارا بانکپن زائل ہو جاتا ہے۔ مجاز کی شاعری کے انقلابی پہلو پر بھی ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے، ہر چند کہ اس کا ہاتھ شمشیر سے زیادہ شناسائے 'ساز و جام' ہے۔ وہ دراصل شباب اور شہنائی کا شاعر ہے۔ "ننھی پجارن" اس کا سب سے بڑا ملکہ ہے۔ حسن و خیال اس کی ذہانت اور فطانت کی زد پر رہتے ہیں۔ وہ ایک سبک روح،

مست نغمہ، پچھاتا ہوا شاعر تھا جس کی دنیا اور ہستی نغمہ طرازی، صہبا پرستی اور شورمستی سے عبارت تھی - رزم ہو یا بزم وہ ہر جگہ پاک دل و پاکباز رہا۔ اس نے نہ یاقوت کھایا نہ زہر اُگلا، ہر وقت اور ہر جگہ شاعر رہا، بلبل رہا، گاتا رہا، نور و نغمہ بکھیرتا رہا۔ اس کے بہت سے نغمے ابھی تک اُن سنے رہے ہیں - اس کی سب سے اچھی مثال اس کا مشہور ترانہ " نذرِ علی گڑھ " ہے - حال ہی میں علی گڑھ کی فضا اس ترانے سے معمور رہنے لگی ہے حالانکہ اس کا چرچا علی گڑھ میں بہت پہلے ہونا چاہیئے تھا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہر شاعر کے یہاں انکشافات کا مواد ہمیشہ موجود ہوتا ہے یہی وجہ جواز ہے اس مختصر انتخاب کی!

غزل

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیِ کرم فرما بھی گئے
اس سعیِ کرم کو کیا کہیے بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے کچھ کہہ نہ سکے کچھ سُن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

آشفتگیِ وحشت کی قسم، حیرت کی قسم، حسرت کی قسم!
اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں ہم رازِ تبسم پا بھی گئے

رودادِ غمِ اُلفت اُن سے ہم کیا کہتے کیونکر کہتے
اک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے

اربابِ جنوں پر فرقت میں اب کیا کہیئے کیا کیا گزری
آئے تھے سوادِ الفت میں کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی!
محفل تو تری سُونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

اُس محفلِ کیف و مستی میں اُس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

۱۹۳۳ء

رات اور ریل

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نیم شب کی خامشی میں زیرِ لب گاتی ہوئی

ڈگمگاتی، جھومتی، سیٹی بجاتی، کھیلتی
وادی و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی

تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرودِ دلنشیں
آندھیوں میں مینہ برسنے کی صدا آتی ہوئی

جیسے موجوں کا ترنم جیسے جل پریوں کے گیت
ایک اک لے میں ہزاروں زمزمے گاتی ہوئی

نونہالوں کو سناتی میٹھی میٹھی لوریاں
نازنینوں کو سنہرے خواب دکھلاتی ہوئی

ٹھوکریں کھا کر لچکتی، گنگناتی جھومتی
سرخوشی میں گھنگروؤں کی تال پر گاتی ہوئی

ناز سے ہر موڑ پر کھاتی ہوئی سو پیچ و خم
اک دلہن اپنی ادا سے آپ شرماتی ہوئی

رات کی تاریکیوں میں جھلملاتی، کانپتی
پٹڑیوں پر دور تک سیماب چھلکاتی ہوئی

جیسے آدھی رات کو نکلی ہو اک شاہی برات
شادیانوں کی صدا سے وجد میں آتی ہوئی

منتشر کر کے فضا میں جا بجا چنگاریاں
دامنِ موجِ ہوا میں پھول برساتی ہوئی

تیز تر ہوتی ہوئی منزل بمنزل دم بہ دم
رفتہ رفتہ اپنا اصلی روپ دکھلاتی ہوئی

سینۂ کہسار پر چڑھتی ہوئی بے اختیار
ایک ناگن جس طرح مستی میں لہراتی ہوئی

اک ستارہ ٹوٹ کر جیسے رواں ہو عرش سے
رفعتِ کہسار سے میدان میں آتی ہوئی

اک بگولے کی طرح بڑھتی ہوئی میدان میں
جنگلوں میں آندھیوں کا زور دکھلاتی ہوئی

رعشہ براندام کرتی انجمِ شب تاب کو
آشیاں میں طائرِ وحشی کو چونکاتی ہوئی

یاد آ جائے پرانے دیوتاؤں کا جلال
ان قیامت خیزیوں کے ساتھ بل کھاتی ہوئی

ایک رخشِ بے عناں کی برق رفتاری کے ساتھ
خندقوں کو پھاندتی ٹیلوں سے کتراتی ہوئی

مرغزاروں میں دکھاتی جوئے شیریں کا خرام
وادیوں میں ابر کے مانند منڈلاتی ہوئی

اک پہاڑی پر دکھاتی آبشاروں کی جھلک
اک بیاباں میں چراغِ طور دکھلاتی ہوئی

جستجو میں منزلِ مقصود کی دیوانہ وار
اپنا سر دُھنتی فضا میں بال بکھراتی ہوئی

چھیڑتی اک وجد کے عالم میں سازِ سرمدی
غیظ کے عالم میں مُنہ سے آگ برساتی ہوئی

رینگتی ، مُڑتی ، مچلتی ، تلملاتی ، ہانپتی
اپنے دل کی آتشِ پنہاں کو بھڑکاتی ہوئی

خود بخود روٹھی ہوئی ، بپھری ہوئی ، بکھری ہوئی
شورِ پیہم سے دلِ گیتی کو دھڑکاتی ہوئی

پُل پہ دریا کے دما دم کوندتی للکارتی
اپنی اس طوفان انگیزی پہ اِتراتی ہوئی

پیش کرتی بیچ ندی میں چراغاں کا سماں
ساحلوں پر ریت کے ذرّوں کو چمکاتی ہوئی

مُنہ میں گھُستی ہے سُرنگوں کے یکایک دوڑ کر
دندناتی ، چیختی ، چنگھاڑتی ، گاتی ہوئی

آگے آگے "جستجو آمیز" نظریں ڈالتی
شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبراتی ہوئی

ایک مجرم کی طرح سہمی ہوئی ، سمٹی ہوئی
ایک مفلس کی طرح سردی میں تھراتی ہوئی

تیزیٔ رفتار کے سکّے جماتی جا بجا
دشت و در میں زندگی کی لہر دوڑاتی ہوئی

ڈال کر گزرے مناظر پر اندھیرے کا نقاب
اک نیا منظر نظر کے سامنے لاتی ہوئی

صفحۂ دل سے مٹاتی عہدِ ماضی کے نقوش
حال و مستقبل کے دلکش خواب دکھلاتی ہوئی

ڈالتی بے حِس چٹانوں پر حقارت کی نظر
کوہ پر ہنستی فلک کو آنکھ دکھلاتی ہوئی

دامنِ تاریکیٔ شب کی اُڑاتی دھجّیاں
قصرِ ظلمت پر مسلسل تیر برساتی ہوئی

زد میں کوئی چیز آ جائے تو اس کو پیس کر
ارتقائے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی

زعم میں پیشانیٔ صحرا پہ ٹھوکر مارتی!
پھر سبک رفتاریوں کے ناز دکھلاتی ہوئی

ایک سرکش فوج کی صورت عَلَم کھولے ہوئے
ایک طوفانی گرج کے ساتھ درّاتی ہوئی

ایک اک حرکت سے اندازِ بغاوت آشکار
عظمتِ انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی

ہر قدم پر توپ کی سی گھن گرج کے ساتھ ساتھ گولیوں کی سنسناہٹ کی صدا آتی ہوئی
وہ ہوا میں سیکڑوں جنگی ڈہل بجتے ہوئے وہ بگل کی جانفزا آواز لہراتی ہوتی

الغرض اُڑتی چلی جاتی ہے بے خوف و خطر
شاعرِ آتش نفس کا خون کھولاتی ہوئی

۱۹۳۳ء

غزل

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا، اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے، وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے شوقِ نظارہ کیا کہئے، نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصوّر کیا کیجے، ہم صورتِ جاناں بھول گئے

اب گُل سے نظر ملتی ہی نہیں، اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو، ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا، اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے، اپنا ہی گریباں بھول گئے

یہ اپنی وفا کا عالم ہے، اب اُن کی جفا کو کیا کہئے
اک نشترِ زہر آگیں رکھ کر نزدیکِ رگِ جاں بھول گئے

۱۹۳۴ء

نذرِ علیگڈھ

سرشارِ نگاہِ نرگس ہوں پابستۂ گیسوئے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بُلبُل ہوں

ہر آن یہاں صہبائے کہن اک ساغرِ نَو میں ڈھلتی ہے

کلیوں سے حُسن ٹپکتا ہے پھولوں سے جوانی اُبلتی ہے

جو طاقِ حرم میں روشن ہے وہ شمع یہاں بھی جلتی ہے

اس دشت کے گوشے گوشے سے اک جُوئے حیات اُبلتی ہے

اسلام کے اس بُت خانے میں اصنام بھی ہیں اور آذر بھی

تہذیب کے اس مے خانے میں شمشیر بھی ہے اور ساغر بھی

یاں حُسن کی برق چمکتی ہے، یاں نُور کی بارش ہوتی ہے

ہر آہ یہاں اک نغمہ ہے ہر اشک یہاں اک موتی ہے

ہر شام ہے شامِ مصر یہاں، ہر شب ہے شبِ شیراز یہاں

ہے سارے جہاں کا سوز یہاں اور سارے جہاں کا ساز یہاں

یہ دشتِ جنوں دیوانوں کا، یہ بزمِ وفا پروانوں کی

یہ شہرِ طرب رومانوں کا یہ خلدِ بریں ارمانوں کی

فطرت نے سکھائی ہے ہم کو افتاد یہاں پرواز یہاں

گائے ہیں وفا کے گیت یہاں، چھیڑا ہے جنوں کا ساز یہاں

اس فرش سے ہم نے اُڑ اُڑ کر افلاک کے تارے توڑے ہیں

ناہید سے کی ہے سرگوشی، پروین سے رشتے جوڑے ہیں

اس بزم میں تیغیں کھینچی ہیں اس بزم میں ساغر توڑے ہیں

اس بزم میں آنکھ بچھائی ہے اس بزم میں دل تک جوڑے ہیں

اس بزم میں نیزے پھینکے ہیں اس بزم میں خنجر چومے ہیں

اس بزم میں گر کر تڑپے ہیں اس بزم میں پی کر جھومے ہیں

آ آ کے ہزاروں بار یہاں خود آگ بھی ہم نے لگائی ہے
پھر سارے جہاں نے دیکھا ہے یہ آگ ہمیں نے بجھائی ہے
یاں ہم نے کمندیں ڈالی ہیں یاں ہم نے شب خوں مارے ہیں
یاں ہم نے قبائیں نوچی ہیں یاں ہم نے تاج اُتارے ہیں
ہر آہ ہے خود تاثیر یہاں ہر خواب ہے خود تعبیر یہاں
تدبیر کے پائے سنگیں پر جُھک جاتی ہے تقدیر یہاں
ذرّات کا بوسہ لینے کو سَو بار جُھکا آکاش یہاں
خود آنکھ سے ہم نے دیکھی ہے باطل کی شکستِ فاش یہاں
اس گلکدۂ پارینہ میں پھر آگ بھڑکنے والی ہے
پھر ابر گرجنے والے ہیں، پھر برق کڑکنے والی ہے
جو ابر یہاں سے اُٹھے گا، وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا، ہر کوہِ گراں پر برسے گا
ہر سرو و سمن پر برسے گا، ہر دشت و دمن پر برسے گا
خود اپنے چمن پر برسے گا غیروں کے چمن پر برسے گا
ہر شہرِ طرب پر گرجے گا ہر قصرِ طرب پر کڑکے گا
یہ ابر ہمیشہ برسا ہے، یہ ابر ہمیشہ برسے گا

۱۹۳۶ء

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارا پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پر آوارا پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر دہکی ہوئی شمشیر سی!
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور، جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے، کون سمجھے جی کا حال
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہُوک سی سینے میں اُٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہنازِ لالہ رُخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

راستے میں رُک کے دم لے لوں مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفانِ بلا میرے لئے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لئے
پر مصیبت ہے مرا عہدِ وفا میرے لئے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے کہ اب عہدِ وفا بھی توڑ دوں
اُن کو پا سکتا ہوں میں، یہ آسرا بھی توڑ دوں
ہاں مناسب ہے، یہ زنجیرِ ہوا بھی توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ، جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اِس کنارے نوچ لوں اور اُس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا، سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں سلطانِ جابر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتّھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں، اُس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا، میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

سنہ ۱۹۳۷ء

کس سے محبت ہے؟

بتاؤں کیا تجھے اے ہم نشیں کس سے محبت ہے
میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اُس دنیا کی عورت ہے
سراپا رنگ و بُو ہے پیکرِ حُسن و لطافت ہے
بہشتِ گوش ہوتی ہیں گہر افشانیاں اُس کی

وہ میرے آسماں پر اخترِ صبحِ قیامت ہے
ثریّا بخت ہے، زہرہ جبیں ہے، ماہ طلعت ہے
مرا ایماں ہے، میری زندگی ہے، میری جنت ہے
میری آنکھوں کو خیرہ کر گئیں تابانیاں اُس کی

وہ اک مضراب ہے اور چھیڑ سکتی ہے رگِ جاں کو
وہ چنگاری ہے لیکن پھُونک سکتی ہے گلستاں کو
وہ بجلی ہے جلا سکتی ہے ساری بزمِ امکاں کو
ابھی میرے ہی دل تک ہیں شرر سامانیاں اُس کی

زباں پر ہیں ابھی تک عصمت و تقدیس کے نغمے
وہ بڑھ جاتی ہے اِس دنیا سے اکثر اس قدر آگے
مری تخئیل کے بازو بھی اس کو چھو نہیں سکتے
مجھے حیران کر دیتی ہیں نکتہ دانیاں اُس کی

جبیں پر سایہ گستر پرتوِ قندیلِ رُہبانی!
عذارِ نرم و نازک پر شفق کی رنگ افشانی!
قدم پر لوٹتی ہے عظمتِ تاجِ سُلیمانی!
ازل سے معتقد ہے محفلِ نورانیاں اُس کی

اداِئیں لے کے آئی ہے وہ فطرت کے خزانوں سے
جگا سکتی ہے محفل کو نظر کے تازیانوں سے
وہ ملکہ ہے خراج اُس نے لئے ہیں بوستانوں سے
بس اک میں نے ہی اکثر کی ہیں نافرمانیاں اُس کی

وہ میری جرأتوں پر بے نیازی کی سزا دینا
ہوس کی ظلمتوں پر ناز کی بجلی گرا دینا
نگاہِ شوق کی بے باکیوں پر مسکرا دینا
جنوں کو درسِ تمکیں دے گئیں نادانیاں اُس کی

وفا خود کی ہے اور میری وفا کو آزمایا ہے
مجھے چاہا ہے مجھ کو اپنی آنکھوں پر بٹھایا ہے
مرا ہر شعر تنہائی میں اُس نے گنگنایا ہے
سُنی ہیں میں نے اکثر چھُپ کے نغمہ خوانیاں اُس کی

مرے چہرے پہ جب بھی فکر کے آثار پائے ہیں
مجھے تسکین دی ہے میرے اندیشے مٹائے ہیں
مرے شانے پہ سر تک رکھ دیا ہے گیت گائے ہیں
مری دُنیا بدل دیتی ہے خوش الحانیاں اس کی

لبِ لعلیں پہ لاکھا ہے نہ رخساروں پہ غازہ ہے
جبینِ نور افشاں پر نہ جھُومر ہے نہ ٹیکا ہے
جوانی ہے سہاگ اُس کا تبسّم اُس کا گہنا ہے
نہیں آلودۂ ظلمت سحر دامانیاں اُس کی

کوئی میرے سوا اس کا نشاں پا ہی نہیں سکتا
کوئی اُس بارگاہِ ناز تک جا ہی نہیں سکتا
کوئی اُس کے جنوں کا زمزمہ گا ہی نہیں سکتا
جھلکتی ہیں مرے اشعار میں جولانیاں اُس کی

سنہ ۱۹۳۹ء

مزارِ رہنما

برمزار ڈاکٹر انصاری مرحوم

سُنیں اربابِ دل اہلِ نظر بھی! — نہاں ہے سنگ پاروں میں گہر بھی
جمالِ قوم بھی صاحب نظر بھی! — مسافر بھی، خضر بھی چارہ گر بھی
خنک اور مرمریں مدفن میں پنہاں — خروشِ برق و طوفانِ شرر بھی
سکونِ دیر ۔ تقدیسِ کلیسا — گدائے اُمتِ خیر البشر بھی
یہ تربت ہے امیرِ کارواں کی
یہ منزل بھی ہے شمعِ رہ گذر بھی

سنہ ۱۹۳۹ء

خوابِ سحر

مہر صدیوں سے چمکتا ہی رہا افلاک پر — رات ہی طاری رہی انسان کے ادراک پر
عقل کے میدان میں ظلمت کا ڈیرا ہی رہا — دل میں تاریکی دماغوں میں اندھیرا ہی رہا
اک نہ اک مذہب کی سعیِ خام بھی ہوتی رہی — اہلِ دل پر بارشِ الہام بھی ہوتی رہی
آسمانوں سے فرشتے بھی اُترتے ہی رہے — نیک بندے بھی خدا کا کام کرتے ہی رہے

ابنِ مریم بھی اُٹھے موسیٔ عمراں بھی اُٹھے
رام و گوتم بھی اُٹھے، فرعون و ہاماں بھی اُٹھے
اہلِ سیف اُٹھتے رہے اہلِ کتاب آتے رہے
ایں جناب اُٹھتے رہے اور آنجناب آتے رہے
حکمراں دل پر رہے صدیوں تلک اصنام بھی
ابرِ رحمت بن کے چھایا دہر پر اسلام بھی
مسجدوں میں مولوی خطبے سناتے ہی رہے
مندروں میں برہمن اشلوک گاتے ہی رہے

آدمی منت کشِ اربابِ عرفاں ہی رہا
دردِ انسانی مگر محرومِ درماں ہی رہا

اک نہ اک در پر جبینِ شوق گھستی ہی رہی
آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی
رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی
دین کے پردے میں جنگِ زرگری جاری رہی
اہلِ باطن علم سے سینوں کو گرماتے رہے
جہل کے تاریک سائے ہاتھ پھیلاتے رہے
یہ مسلسل آفتیں، یہ یورشیں، یہ قتلِ عام
آدمی کب تک رہے اوہامِ باطل کا غلام
ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں

کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک اُدھر دیکھا تو ہے

سنہ ۱۹۳۹ء

غزل

اذنِ خرام لیتے ہوئے آسماں سے ہم
ہٹ کر چلے ہیں رہگذرِ کارواں سے ہم
کیا پوچھتے ہو جھومتے آئے کہاں سے ہم
پی کر اُٹھے ہیں خمکدۂ آسماں سے ہم
کیونکر ہوا ہے فاش زمانہ پہ کیا کہیں
وہ رازِ دل جو کہہ نہ سکے رازداں سے ہم
ہمدم یہی ہے رہگذرِ یارِ خوش خرام
گذرے ہیں لاکھ بار اسی کہکشاں سے ہم
کیا کیا ہوا ہے ہم سے جنوں میں نہ پوچھئے
اُلجھے کبھی زمیں سے کبھی آسماں سے ہم

ہر نرگسِ جمیل نے مخمور کر دیا
پی کر اُٹھے شراب ہر اک بوستاں سے ہم
ٹھکرا دیے ہیں عقل و خرد کے صنم کدے
گھبرا چکے تھے کشمکشِ امتحاں سے ہم
دیکھیں گے ہم بھی کون ہے سجدہ طرازِ شوق
لے سر اُٹھا رہے ہیں ترے آستاں سے ہم
بخشی ہیں ہم کو عشق نے وہ جرأتیں مجازؔ
ڈرتے نہیں سیاستِ اہلِ جہاں سے ہم

سنہ ۱۹۴۱ء

عیادت

یہ کون آ گیا رُخِ خنداں لئے ہوئے
عارض پہ رنگ و نور کا طوفاں لئے ہوئے
بیمار کے قریب بصد شانِ احتیاط!
دلدارئ نسیمِ بہاراں لئے ہوئے
رُخسار پر لطیف سی اک موجِ سرخوشی
لب پر ہنسی کا نرم سا طوفاں لئے ہوئے
پیشانئ جمیل پہ انوارِ تمکنت
تابندگئ صبحِ درخشاں لئے ہوئے
زلفوں کے پیچ و خم میں بہاریں چھپی ہوئی
اک کاروانِ نکہتِ بُستاں لئے ہوئے
آ ہی گیا وہ میرا نگارِ نظر نواز!
ظلمت کدے میں شمعِ فروزاں لئے ہوئے
اک اک ادا میں سیکڑوں پہلوئے دلدہی
اک اک نظر میں پرسشِ پنہاں لئے ہوئے
میرے سوادِ شوق کا خورشیدِ نیم شب
عزمِ شکستِ ماہ جبیناں لئے ہوئے
درسِ سکون و صبر بہ ایں اہتمامِ ناز
نشتر زنئ جنبشِ مژگاں لئے ہوئے
آنکھوں سے ایک رَو سی نکلتی ہوئی ہر آن
غرقابئ حیات کا ساماں لئے ہوئے
ملتی ہوئی نگاہ میں بجلی بھری ہوئی
کھلتے ہوئے لبوں میں گلستاں لئے ہوئے
یہ کون ہے مجازؔ سے سرگرمِ گفتگو
دونوں ہتھیلیوں پہ زنخداں لئے ہوئے

سنہ ۱۹۴۴ء

مادام

زلف کی چھاؤں میں عارض کی تب و تاب لئے
لب پہ افسوں لئے آنکھوں میں مئے ناب لئے

ہر نفس رُو میں لئے شورشِ طغیانِ نہاں
ہر نظر شوق کا افسانۂ بے تاب لئے

سحر و اعجاز لئے جنبشِ مژگانِ دراز
خندۂ شوخ جمالِ دُرِ خوش آب لئے

ضو فگن روئے حسیں پر شبِ مہتاب شباب
چشمِ مخمور نشاطِ شبِ مہتاب لئے

نشۂ نازِ جوانی میں شرابور ادا
جسم ذوقِ گُہر و اطلس و کمخواب لئے

زلفِ شبرنگ لئے صندل و عود و عنبر
خمِ ابروئے حسیں دیر کی محراب لئے

لبِ گلرنگ و حسیں، جسم گداز و سیمیں
شوخیٔ برق لئے لرزشِ سیماب لئے

ایک صیاد خوش اندامِ سوادِ مشرق
زلفِ بنگال لئے، طلعتِ پنجاب لئے

نزہت و ناز کا اک پیکرِ شاداب و حسیں
نکہت و نُور کا اُمڈا ہوا سیلاب لئے

میری وارفتگیٔ شوق مسلّم، لیکن
کس کی آنکھیں ہیں زُلیخا کا حسیں خواب لئے

سنہ ۱۹۴۴ء

شرارے

خود کو بہلاتا تھا آخر خود کو بہلاتا رہا
میں بہ ایں سوزِ دروں ہنستا رہا گاتا رہا

مجکو احساسِ فریبِ رنگ و بُو ہوتا رہا
میں مگر پھر بھی فریبِ رنگ و بو کھاتا رہا

میری دنیائے وفا میں کیا سے کیا ہونے لگا
اک دریچہ بند مجھ پر ایک وا ہونے لگا

اک نگارِ نازکی پھرنے لگیں آنکھیں مجاز
اک بُتِ کافر کا دل درد آشنا ہونے لگا

عین ہنگامِ طرب، روحِ طرب تھرّا گئی
دفعتاً دل کے افق پر اک گھٹا سی چھا گئی

ایک آغوشِ تمنا کا تقاضا دیکھ کر — ایک دل کی سرد مہری بھی مجھے یاد آگئی
مجرمِ سرتابیٔ حسنِ جواں ہو جائیے — گلفشانی تا کجا، شعلہ فشاں ہو جائیے

کھائیے گا اک نگاہِ لطف کا کب تک فریب
کوئی افسانہ بنا کر بدگماں ہو جائیے

سنہ ۱۹۴۵ء

اعتراف

اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو؟
میں نے مانا کہ تم اک پیکرِ رعنائی ہو
چمنِ دہر میں روحِ چمن آرائی ہو
طلعتِ مہر ہو، فردوس کی برنائی ہو
بنتِ مہتاب ہو گردوں سے اتر آئی ہو
مجھ سے ملنے میں اب اندیشۂ رسوائی ہے
میں نے خود اپنے کئے کی یہ سزا پائی ہے
خاک میں آہ ملائی ہے جوانی میں نے
شعلہ زاروں میں جلائی ہے جوانی میں نے
شہرِ خوباں میں گنوائی ہے جوانی میں نے
خوابگاہوں میں جگائی ہے جوانی میں نے
حسن نے جب بھی عنایت کی نظر ڈالی ہے
میرے پیمانِ محبت نے سپر ڈالی ہے

اندنوں مجھ پہ قیامت کا جنوں طاری تھا
سر پہ سرشاریٔ عشرت کا جنوں طاری تھا
ماہ پاروں سے محبت کا جنوں طاری تھا
شہر یاروں سے رقابت کا جنوں طاری تھا
بسترِ مخمل و سنجاب تھی دنیا میری
ایک رنگین و حسیں خواب تھی دنیا میری

جنتِ شوق تھی بیگانۂ آفاتِ سموم
درد جب درد نہ ہو۔ کاوشِ درماں معلوم
خاک تھے دیدۂ بیباک میں گردوں کے نجوم
بزم پروین تھی نگاہوں میں کنیزوں کا ہجوم
لیلیٔ ناز برافگندہ نقاب آتی تھی
اپنی آنکھوں میں لئے دعوتِ خواب آتی تھی

سنگ کو گوہرِ نایاب و گراں جانا تھا
دشتِ پرخار کو فردوسِ جواں جانا تھا
ریگ کو سلسلۂ آبِ رواں جانا تھا
آہ یہ راز ابھی میں نے کہاں جانا تھا
میری ہر فتح میں ہے ایک ہزیمت پنہاں
ہر مسرّت میں ہے رازِ غم و حسرت پنہاں

کیا سنوگی مری مجروح جوانی کی پکار
میری فریاد جگر دوز، مرا نالۂ زار

شدّتِ کرب میں ڈوبی ہوئی میری گفتار
میں کہ خود اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار
وہ گدازِ دلِ مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں
میرے سائے سے ڈرو تم مری قربت سے ڈرو
اپنی جرأت کی قسم اب مری جرأت سے ڈرو
تم لطافت ہو اگر میری لطافت سے ڈرو
میرے وعدوں سے ڈرو میری محبت سے ڈرو
اب میں الطاف و عنایت کا سزاوار نہیں
میں وفادار نہیں، ہاں میں وفادار نہیں
اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو؟

سنہ ۱۹۴۵ء

سانحہ

(گاندھی جی کی موت سے متاثر ہوکر)

درد و غمِ حیات کا درماں چلا گیا — وہ خضرِ عصر و عیسیٔ دوراں چلا گیا
ہندو چلا گیا، نہ مسلماں چلا گیا — انساں کی جستجو میں اک انساں چلا گیا
رقصاں چلا گیا، نہ غزلخواں چلا گیا — سوز و گداز و درد میں غلطاں چلا گیا
برہم ہے زلفِ کفر، تو ایماں ہے سرنگوں — وہ فخرِ کفر و نازشِ ایماں چلا گیا
بیمار زندگی کی کرے کون دلدہی — نبّاض و چارہ سازِ مریضاں چلا گیا
کس کی نظر پڑے گی اب "عصیاں" پہ لطف کی — وہ محرمِ نزاکتِ عصیاں چلا گیا

وہ رازدارِ محفلِ یاراں نہیں رہا
وہ غم گسارِ بزمِ حریفاں چلا گیا

اب کافری میں رسم و رہِ دلبری نہیں
ایماں کی بات یہ ہے کہ ایماں چلا گیا

اک بیخودِ سرورِ دل و جاں نہیں رہا
اک عاشقِ صداقتِ پنہاں چلا گیا

باچشمِ نم ہے آج زلیخائے کائنات
زنداں شکن وہ یوسفِ زنداں چلا گیا

اے آرزو وہ چشمۂ حیواں نہ کر تلاش
ظلمات سے وہ چشمۂ حیواں چلا گیا

اب سنگ و خشت و خاک و خذف سربلند ہیں
تاجِ وطن کا لعلِ بدخشاں چلا گیا

اب اہرمن کے ہاتھ میں ہے تیغِ خونچکاں
خوش ہے کہ دست و بازوئے یزداں چلا گیا

دیوِ بدی سے معرکہ سخت ہی سہی
یہ تو نہیں کہ زورِ جواناں چلا گیا

کیا اہلِ دل میں جذبۂ غیرت نہیں رہا
کیا عزمِ سرفروشیِ مرداں چلا گیا

کیا باغیوں کی آتشِ دل سرد ہو گئی
کیا سرکشوں کا جذبۂ پنہاں چلا گیا

کیا وہ جنون و جذبۂ بیدار مر گیا
کیا وہ شبابِ حشر بداماں چلا گیا

خوش ہے بدی جو دام یہ نیکی پہ ڈال کے
رکھ دیں گے ہم بدی کا کلیجہ نکال کے

سنہ ۱۹۵۰ء

مجاز کا فن — ایک تجزیہ

سیّد مشرف علی

انسان کے ذوقِ جمال کی نمود و تکمیل میں شعر و ادب نے جو اہم حصہ لیا ہے وہ اپنی جگہ ایک طویل تہذیبی داستان ہے۔ یہ سوال کہ شاعری کہاں تک ایک اجتماعی فریضہ، کہاں تک ایک انفرادی ضرورت، اور کہاں تک انسان کے ذوقِ جمال کا نمود و ظہور ہے، اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ اور اس پر جو بھی فکر صرف کی جائے وہ اپنی جگہ نتیجہ خیز ہی ہوگی۔ میں اس وقت اس بحث میں الجھنا مناسب نہیں سمجھتا۔ وجدانی طور پر میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ اچھی شاعری وہی ہے جو دل و دماغ کو کسی حیثیت سے بھی توانا اور صحت مند اثرات سے بہرہ ور کرے۔ توانا اور صحت مند اثرات صرف براہ راست تبلیغ کا ہی اجارہ نہیں ہیں۔ یہ عام تجربہ ہے کہ وہ اثرات جو بالواسطہ ذہن پر پیدا ہوتے ہیں۔ زیادہ دور رس اور زیادہ پائیدار ہوتے ہیں۔

مجاز کی شخصیت اور شاعری کے مطالعہ سے جو چیز سب سے پہلے نمایاں ہوتی ہے وہ یہ احساس ہے کہ وہ ابھی راہ کے درمیان میں ہے، کسی منزل پر نہیں پہنچا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا درمیانِ راہ کے تجربے جو اُسے ذوقِ لذت پر ابھارتے ہیں، نشاط کے نغمے بے اختیار اس کی زبان پر لے آتے ہیں اندرونی طور پر اس کے دل و دماغ کو اس طرح مجروح بھی کر دیتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی دیدہ زیب سہی بہرحال خونی تہہ قائم ہو جاتی ہے۔ مجاز کی شخصیت میں جتنی محبوبیت ہے اسی درجہ عبرت کا سامان ہے۔ وہ ایک فراخ طبیعت انسان تھا جو زندگی کو خوشگواری کے ساتھ برتنے کی تمنا رکھتا تھا اس کی نگاہیں رنگ و نکہت کے جادو کو جگاتی تھیں اور اس کے نغمے سینے کی اندرونی دھڑکنوں کو

زبان دے دیتے ہیں۔ وہ ایک خوش مزاج نشاط پسند، عیش محفل کی داد دینے والا انسان تھا لیکن اس کی زندگی بہت کم تمناؤں کی تکمیل کا سامان بن سکی۔ بیشتر اس نے لذتِ دل کے جام ومینا توڑے ہیں اور نغمہ نیم شب کو فغان سحر بنا ڈالا ہے۔ زندگی کے یہی اطوار کشمکش کے وہ سامان پیدا کرتے ہیں۔ جو انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے ہر انسان کے دماغ میں وجہ خلش بنتے ہیں۔ اور فنکار کے یہاں یہی چیزیں شدید ہو کر اس کے فن کا موضوع بن جاتی ہیں کچھ لوگ ہیں جو میرؔ کی طرح شائستہ آہ وفریاد کو اپنا مسلک بنا لیتے ہیں اور اس طرح غم دوراں، غم جاناں، سب کو اپنے اندرون وجود میں تحلیل کرتے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جو غالبؔ کی طرح غم پر تڑپتے ہیں، احتجاج کرتے ہیں اور غموں سے کھل کر لڑنا چاہتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ زندگی کے غموں سے بے پروا ہو کر نے نوازی کرتے ہیں کہ اس طرح ان کی تسکین دل کا سامان ہوتا رہے۔ مجاز بھی اسی صفت کا آدمی تھا زندگی نے اس کے ساتھ جو برتاؤ کیا، مشاعروں کی داد وتحسین سے قطع نظر اپنی انفرادی دنیا میں اسے جو سناٹے سے نظر آئے اور زندگی کو جن بے کیفیوں سے سابقہ پڑا۔ انھوں نے اس کے تصوارات میں اندرونی طور پر بڑا انتشار پیدا کر دیا مجاز کی شراب نوشی کا بھی یہی حال تھا "اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے"، کہا جاسکتا ہے کہ اس کی شخصیت میں یہ آن کیوں نہ پیدا ہو سکی کہ وہ مردانہ وار غم زندگی کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں آجاتا۔ مجاز اس طبعیت کا آدمی نہ تھا وہ ان لوگوں میں نہیں تھا جو دوسروں کا خون بہا کر ہیرو بنتے ہیں۔ وہ ان لوگوں میں تھا جو اپنے خون تمنا سے بزم کی رونق بڑھاتے ہیں۔

مجاز کی زندگی ایک المیہ (TRAGEDY) ہے ایک پر درد داستان ایک انتہائی غم انگیز گیت جس میں خوشی کی لہریں صرف اس لیے آتی ہوں کہ غم کا تاثر اور بڑھ جائے۔ اس کی زندگی نے بڑی بے دردی کے ساتھ اس عبرت کو نمایاں کیا جو بیشتر فنکاروں کا حصہ رہی ہے جب ہم اُس کا ذوق سرمستی دیکھتے ہیں، اس کی محفل آرائی کا شوق ہماری نگاہوں کے سامنے آتا ہے اور اس کی زبان سے ہم بہ رجز سنتے ہیں کہ۔

اس بزم میں تیغیں کھینچی ہیں اس بزم میں ساغر توڑے ہیں
اس بزم میں آنکھ بچھائی ہے اس بزم میں دل تک جوڑے ہیں
اس بزم میں نیزے پھینکے ہیں اس بزم میں خنجر چومے ہیں
اس بزم میں گر گر تڑپے ہیں اس بزم میں پی کر جھومے ہیں
آآ کے ہزاروں بار یہاں خود آگ بھی ہم نے لگائی ہے
پھر سارے جہاں نے دیکھا ہے یہ آگ ہمیں نے بجھائی ہے
یاں ہم نے کمندیں ڈالی ہیں یاں ہم نے شب خوں مارے ہیں
یاں ہم نے قبائیں نوچی ہیں یاں ہم نے تاج اتارے ہیں

تو ہمیں حیرت ہونے لگتی ہے کہ ایسا حوصلہ پیکار رکھنے والا فراخ مشرب نوجوان کس طرح اپنی زندگی ہی میں غموں کے سامنے سپر انداختہ ہو کر رہ گیا کہ اس کی زندگی بہت حد تک قابل رحم بن گئی فن زندگی کی پردہ پوشی کرتا رہتا ہے، یہ اس کا بڑا کمال ہے لیکن زخموں پر پردہ ڈالنے سے مرہم نہیں ملا کرتا ایک وقت آتا ہے کہ وہ زخم پردے میں چاک پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تمنا اور حسرت کی کش مکش اور فن اور زندگی کی بے رابطگی نمایاں ہو کر بالکل سامنے آجاتی ہے فنکار کے تصورات ایک چیز ہیں اور زندگی کی حقیقتیں بیشتر حالتوں میں بالکل دوسری ہیں۔ فن زندگی کے خوابوں کی تعبیر ہمیشہ رہا ہے زندگی کی دروبست کی تدبیر بہت کم بن سکا ہے اسے فن کی عاجزی سمجھیے یا زندگی کی، ظلم پسندی؛ بہرحال یہ تلخ حقیقت ادب میں اکثر ابھرتی رہی ہے اور ابھرتی رہے گی۔ مجاز مرحوم اس تلخ حقیقت کا ایک عبرت انگیز نمونہ ہماری نگاہوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

مجاز کی شاعری میں غم بھی ملتا ہے۔ یہ غم نہ کوئی رسمی تخلیق ہے اور نہ آورد کی چیز ایسے موقع آتے ہیں جب اُسے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ تنہا بزم طرب سے دور نہیں ہے بلکہ زندگی کے اطمینان سے بھی دور ہے۔ کوئی مبہم سی خواہش جو بے اختیار اسے بے چین کرتی ہے اسے اپنی طرف کھینچتی ہے، وہ ٹھیک سے سمجھ بھی نہیں پاتا کہ اپنی تکمیل خواہش کا سامان کیونکر پیدا کرے

ایک حسرت سی دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔ یہی مبہم آرزو اور اسی کی خاطر حیرت و حسرت کے پھیلنے والے میدان اس کی شاعری کو ایک لذت سے بھرا ہوا درد دیتے ہیں رومانیت ایسے ہی اجزا سے بنتی ہے جہاں ابہام، نظر کی خیرگی، ذہن و دل کی حسرت زدگی ایک نہ معلوم سی تڑپ اور نہ سمجھنے والا درد ہوتا ہے۔ مجاز کی شاعری رومانیت کا ایک گہرا انداز رکھتی ہے۔ اُردو میں رومانی ادب فلسفیانہ کم ہے۔ خیال آرائی اور آرائش بیان سے زیادہ عبارت ہے۔ مجاز نے اپنی شاعری کو فلسفیانہ انداز نہیں دیا۔ اس کے یہاں رومانیت عورت کی کارفرمائی، دل و دماغ کے حوصلوں بیان کی نغمگی اور مبہم آرزؤں کے جادو سے ملتی ہے لیکن مجاز کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے یہاں یہ رنگ بہت شائستہ اور بہت نکھرا ہوا ہے۔ یہ ایک ایسی طبیعت کا پتہ دیتا ہے جو جنون و محبت کی ادب آشنا ہے اور سلیقہ جس کے لیے بہت بڑی چیز ہے۔ مجاز کا تعارف ادبی دنیا سے خصوصی طور پر ترقی پسند ادیبوں کے واسطے سے ہوا۔ ترقی پسند ادیب ادب کا یہ تصور لے کر اٹھے کہ ادب زندگی کی عکاسی اور ترجمانی ہے اور ادب کا فرض ہے کہ وہ زندگی کی کش مکش میں خاموش ناظر بن کر نہ رہ جائے بلکہ موج و طوفان سے کھیلے تاکہ ساحل کی رونق زد میں نہ آنے پائے۔ مجاز ظلم کا دشمن ہے۔ وہ بھی سامراجی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ عوام میں آزادی کی لہر دیکھ کر وہ بھی بے اختیار مسرت کے لہجہ میں کہہ اٹھتا ہے۔

بول ری دھرتی بول
راج سنگاسن ڈاواں ڈول

بول ری دھرتی بول.....

مجاز کے سلسلہ میں ایک چیز خاص طور پر نگاہ میں رکھنے والی ہے وہ یہ کہ روزِ اول سے اس کے کلام میں وہ رچا ہوا رنگ رہا جو غزل کا سب سے بڑا فیضان ہے۔ اس کی شاعری میں جو نفاست نغمگی، سوز اور تڑپ اور بات کو دل نشیں بنا کر کہنے کا سلیقہ ملتا ہے وہی درحقیقت اس کے فن کی حقیقی خوبی ہے۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دیوانے میں کتنی فرزانگی اور اس وارفتہ حسن میں

آداب محبت کا کس درجہ لحاظ تھا۔ مجاز کسی بھی حلقہ سے وابستہ رہا ہو لیکن اس کی شاعری کبھی بھی کسی ایک حلقے تک محدود نہ رہی۔ یہ زبردست مقبولیت مجاز کو صرف اس لیے حاصل ہوئی کہ غیر شعوری طور پر سہی وہ یہ جانتا تھا کہ ہر ادب کی روایات اس کی تہذیب کی گود سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور ان میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ اس تہذیب کے پورے حلقے کے لیے سامان تسکین فراہم کرتی رہیں۔ یہ احساس جس ادیب اور شاعر میں جتنا زیادہ قوی ہوگا اتنا ہی اس کے ادب میں زیادہ جان ہوگی اور اسی قدر مقبولیت کے ساتھ خدمت ادب کر سکے گا۔

مجاز کی موت سے نئی نسل کو یہ محسوس ہوا گویا ان کا سب سے زیادہ دل نشیں شاعر چھن گیا۔ ادب زندگی کو اثر و تاثیر دینے والے فنون میں ایک باعظمت فن ہے۔ وہ فنکار یقیناً ادبی قدر و ستائش کے مستحق ہیں جن کی آواز پر زمانہ یہ کہہ اٹھے کہ

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

شکیل بدایوانی

نوحۂ مجاز

(۱)

او زندہ دل مجاز تجھے آخری سلام
او میرے دلنواز تجھے آخری سلام
او رندِ پاکباز تجھے آخری سلام

(۲)

تو جا رہا ہے چھوڑ کے بازیچۂ حیات
لیکن پکارتی ہے تجھے روح کائنات
تو اس قدر خموش! کہ سنتا نہیں ہے بات

(۳)

اُف اِس قدر خموش! ارے اس قدر خموش
کیا کہہ رہے ہیں؟ سُن۔ ترے اربابِ نا و نوش
یہ میکشی بھی کیا؟ نہ رہے زندگی کا ہوش

(۴)

کروٹ ترے بغیر نہ بدلیں گے صبح و شام
اسٹیم کے گیت گائے گا۔ ڈالر کا ہر غلام
رُک جا۔ بُلا رہے ہیں تجھے مضمحل عوام

(۵)

ہیں یوں تو لاکھ امن کے پیغامبر یہاں
ہاں تیری بات اور تھی - افسوس تو کہاں
ڈر ہے کہ ٹوٹ جائے نہ شیشے کا یہ جہاں

(۶)

شیشے کے اس جہان میں لاکھوں ہیں مورتیں
دل جن کے ہیں اُداس - پریشاں ہیں صورتیں
پستی ہیں ہر مشین میں جن کی ضرورتیں

(۷)

ان مورتوں کو تیری ضرورت ہے اندنوں
رُک جا - کہ تیرا ہجر قیامت ہے اندنوں
دُنیا پناہ خواہِ محبت ہے اندنوں

(۸)

تجھ کو پکارتی ہیں دھڑکتی جوانیاں
یاد آرہی ہیں سب کو تری مہربانیاں
آکر سنادے ان کو - انھیں کی کہانیاں

(۹)

جھنکار چوڑیوں کی خموشی میں کھو گئی
آکاش میں بہار - ستارے پرو گئی
ساغرؔ پکارتا ہے کہ آ رات ہو گئی

(۱۰)

لیکن تری جگہ تو ستاروں سے دُور ہے
دنیا کی "ہولناک بہاروں سے دُور ہے
تو" اب ہماری راہگذاروں سے دُور ہے

(۱۱)

دل کو یقین ہے کہ تو واپس نہ آئے گا
آیا - تو یہ طلسم ازل ٹوٹ جائے گا
جیسے یہاں نبھائی - وہاں بھی نبھائے گا

(۱۲)

کیا غم! چلا جو غلغلۂ جنگ چھوڑ کے
دیکھیں گے - ہولیوں میں ترا رنگ چھوڑ کے
شاید یونہی گیا ہے تو آہنگ چھوڑ کے

(۱۳)

اے زندہ دل مجاز - تجھے آخری سلام
اے میرے دلنواز - تجھے آخری سلام
اے رندِ پاکباز - تجھے آخری سلام

شہید صفی پوری

شکستہ ساز

خموش نغمۂ ہستی ہے ساز ٹوٹ گیا　　طلسمِ عشق و فسونِ نیاز ٹوٹ گیا
تسلسلِ المِ جانگداز ٹوٹ گیا　　ستم ہے رشتۂ جانِ مجاز ٹوٹ گیا

اسیر چھوٹ گیا سوگوار زنداں ہے

زباں پہ حرفِ شکایت نہ درد کی روداد　　غمِ بہار ہے باقی نہ شکوۂ صیاد
نہ التہابِ تمنّا نہ حسرتِ فریاد　　نہ بے بسی کا اندھیرا نہ ظلمتِ بیداد

نہ اضطراب نمایاں نہ سوزِ پنہاں ہے

امینِ کشمکشِ ذوقِ جستجو نہ رہا　　قتیلِ شوق، گنہگارِ آرزو نہ رہا
اداشناسِ حسینانِ خوبرو نہ رہا　　کنارِ باغ کے نباضِ رنگ و بو نہ رہا

چمن سے رخصتِ صورت گرِ بہاراں ہے

زبانِ دل پہ تھا جس کی پیامِ بیداری　　تنِ نحیف میں الفت کی روح تھی ساری
جگر کے خوں سے کیا جس نے عزمِ گلکاری　　اُسے لحد میں چھپانے کی اب ہے تیاری

وداعِ شاعرِ محنت کشان و دہقاں ہے